کلیات
میکش اکبر آبادی

مرتب

پروفیسر فضل امام

کلیات

میکش اکبر آبادی

مرتب

پروفیسر فضل امام

کلیات میکش اکبر آبادی

مرتب
پروفیسر فضل امام

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون ایف سی، 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا نئی دہلی۔110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت : 2017

تعداد : 550

قیمت : -/180 روپے

سلسلۂ مطبوعات : 1935

Kulliyat-e-Mekash Akbarabadi

By: Prof. Fazle Imam

ISBN :978-93-5160-176-0

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی 110025 فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، آر-کے-پورم، نئی دہلی-110066 فون نمبر: 26109746
فیکس: 26108159 ای-میل: ncpulsaleunit@gmail.com
ای-میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: ہائی ٹیک گرافکس، ڈی 8/2، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز II، نئی دہلی-110020
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

انسان اشرف المخلوقات ہے۔ تمام مخلوق میں وہ اشرف اس لیے ہے کہ اسے شعور و نطق عطا کیا گیا ہے۔ اس شعور کی بدولت اس نے اسرارِ کائنات سے آگہی حاصل کی تو نطق نے کائنات کے ان اسرار و رموز کو دوسروں پر ظاہر کیا۔ نطق نے جو اسرار و رموز بیان کیے اُنھیں سینہ بہ سینہ محفوظ رکھا گیا اور جب فنِ تحریر کا آغاز ہوا تو ان اسرار کو تحریر میں لاکر زیادہ لمبے عرصے کے لیے محفوظ کر دیا گیا۔

پیغمبروں سے لے کر صوفی سنتوں اور اصلاحی نقطۂ نظر رکھنے والے شاعروں تک نے اس اشرف المخلوق یعنی انسان کے باطن کی تطہیر کا کام کیا ہے۔ ان مقدس پیغمبروں اور صوفی سنتوں کے اقوال سینہ بہ سینہ ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتے رہے۔ انسان کے باطن کی تہذیب و تطہیر کے ساتھ ساتھ اسے ظاہری علوم سے واقفیت کی ضرورت بھی محسوس ہوئی اور اس نے تاریخ، فلسفہ، سیاست، سائنس، اقتصادیات اور سماجیات وغیرہ کا علم بھی حاصل کیا۔ ان دونوں طرح کے علوم یعنی باطنی و ظاہری کو زیادہ عرصے تک محفوظ رکھنے اور دوسری نسلوں کے لیے مشعلِ راہ بنانے کے لیے انسان کو تحریر کی ضرورت محسوس ہوئی اور یہی ضرورت فنِ تحریر کی ایجاد کا محرک بنی۔

انسانی ذہن چونکہ تغیر پسند اور مسلسل ترقی کا متلاشی رہا ہے لہٰذا فنِ تحریر کے بعد اس نے چھپائی کا فن ایجاد کیا اس فن نے الفاظ کے ذخیرے کو عرصۂ دراز تک کے لیے محفوظ کر دیا۔ الفاظ کے ذخیرے کا نام ہی کتاب ہے۔ کتابوں میں موجود یہ الفاظ کا ذخیرہ مختلف علوم وفنون سے متعلق ہے اور ان علوم کی ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان کا بنیادی مقصد اُردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور اُنھیں کم سے کم قیمت پر علم وادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اُردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کو سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دل عزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی توجہ صرف کی ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان نے اب تک جو کتابیں بھی شائع کی ہیں، اُردو قارئین نے ان کی بھرپور پزیرائی کی ہے۔ کونسل نے ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اُمید ہے کہ یہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہلِ علم سے میری گزارش ہے کہ اگر اس کتاب میں اُنھیں کوئی غلطی نظر آئے تو ہمیں لکھیں تا کہ اگلی اشاعت میں اسے دور کر دیا جائے۔

سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

ڈائرکٹر

فہرست

تعارف		xi
حرف چند		xxiii
میکدہ		1
i	1929	3
ii	مدحت امیرالمومنین علیہ السلام	13
iii	غیرتِ محبت	15
iv	عقل	16
v	حقیقتِ صبح	17
vi	صبحِ بہار	19
vii	حسنِ عمل	21
viii	مدارائے ہوس	25
ix	1928	29
x	کیفِ خودی	41

xi	ہلالِ عید	43
xii	علمِ انسان	45
xiii	1927	47
xiv	انتقامِ ناکامی	53
xv	میرا مشرب	55
xvi	دُنیا دیوانی ہے	57
xvii	1926	59
xviii	جب دل نہ آیا تھا	69
xix	سہرا	73
xx	1925	75
xxi	خمارِ دوشینہ	79
xxii	بادل میں	81
xxiii	سیرِ دل	83
xxiv	1924	87
xxv	صحرائے غم میں	97
xxvi	ارتقا اُلفت	101
xxvii	1923	105
xxviii	1922	109
xxix	1921	113
xxx	1920	119
xxxi	مثنوی زہرِ غم	125
xxxii	ازابتدا تا 1919	129
-2	حرفِ تمنا	141

	i	حرفِ اوّل	143
-3	غزلیں		147
-4	نظمیں		241
	i	نغمۂ حیات	243
	ii	سنگ و شرار	244
	iii	خاتمۂ زمینداری	244
	iv	منجم	245
	v	انسانِ کامل	245
	vi	دل اور حُسن	247
	vii	عزمِ مجبور	249
	viii	اپنا توبن	251
	ix	ضابطے کی زندگی	253
	x	کرشمۂ دل	255
	xi	آزادی	256
	xii	اگست 1947	257
	xiii	آزردگی بے سبب	258
	xiv	جبرِ آرزو	259
	xv	عذرِ جنوں	261
	xvi	فتنۂ معصوم	263
	xvii	قحطِ بنگال پر	265
	xviii	عذرِ عیادت	267
	xix	مرہم و نشتر	269
	xx	دورِ جنگ	271

xxi	ایک نرس سے	273
xxii	داستانِ محبت	275
xxiii	ٹوٹا ہوا تارا	277
xxiv	مردِ قلندر	279
xxv	معذرت	281
xxvi	رجز	282
xxvii	موجِ طوفاں	283
xxviii	رہبر	284
xxix	ریاکاری	285
xxx	سلام	287
xxxi	مشرق و مغرب	289
xxxii	میری خصلت	291
xxxiii	جلوۂ حجاب	293
xxxiv	جمالِ راہنما	295
xxxv	حشرِ وداع	297
xxxvi	کشمکش	299
xxxvii	بادۂ دوشینہ	301
xxxviii	شامِ تنہائی	303
xxxix	شیخ و رند	305
xl	؟	307
xli	مشکلِ غم	309
xlii	عذرِ عشق	311
xliii	تصادم	313

	xliv	محبوبہ شفق	315
	xlv	مقتضائے فطرت	317
	xlvi	برسات کا ایک دن	319
	xlvii	خود بینی 1	323
	xlviii	صبح	325
	xlix	عشق و ہوس	329
	l	از راہِ محبت	333
	li	جب دل نہ آیا تھا	335
	lii	اسیر فرقت کی پہلی شام	337
-5	رباعیات		341
-6	داستانِ شب		343
	i	مصنف کا مختصر تعارف	345
	ii	نعت و منقبت	347
	iii	در مدحِ مُرشدِ خود گوید	351
	iv	شعر	355

تعارف

اِس وقت میرا مدعا نہ تو ''شاعری'' پر کوئی بصیرت افروز ''مقدمہ'' لکھنا ہے اور نہ کسی شاعر کا ''میرزا غالب'' سے ''موازنہ'' کرنا بلکہ ایک ایسے شاعر سے ''تعارف'' مقصود ہے جو کیا بلحاظ ''تخیل'' اور کیا بحیثیت ''جذبات'' موجودہ دنیائے شاعری سے الگ ہے۔ بنابریں یہ کہا ہی نہیں جاسکتا کہ وہ کسی سے کم ہے یا زیادہ۔ اس مسئلہ کا حل ''کہ کن اصولوں کے ماتحت زیرِنظر کلام کو جانچا جائے؟ میری قوتِ علمی سے دشوار ہے۔ ناقدین خود فیصلہ کرلیں گے۔ میں تو محض ذاتی واقفیت کی بنا پر جو کچھ جانتا تھا وہ حوالہ قلم ہے۔ اس میں سے کچھ حصہ صاحب میکدہ کی شخصیت کے متعلق ہے اور وہ بھی صرف اس قدر جس کا اثر میرے خیال میں کلام پر واقع ہوا ہے اور کچھ حصہ کلام کے متعلق۔

تعارف کی ضرورت

اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس مزید تعارف کی کیا ضرورت ہے؟ جب کہ ہندوستان بھر کے مختلف اخبارات و رسائل میں عرصے سے جناب میکش کا کلام شائع ہو رہا ہے اور خاص خاص رسائل آپ کا شاندار تعارف بھی کرا چکے ہیں۔ خصوصاً ''نغمہ اور اسلام'' کی تصنیف سے موصوف کی ایک ایسی علمی ہستی قائم ہو چکی ہے جس سے اہل علم اور خصوصاً اخبارات و رسائل بیں حضرات ناواقف نہیں ہیں۔

میرے خیال میں کسی شے کی ضرورت یا اُس کا سبب وجود معلوم کرنا ایک ایسی بات ہے جس کا کوئی متعین جواب نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن واقعہ ہے کہ ابھی شاید "آگرہ" میں بھی ایسے اصحاب بہت ہوں گے جو حضرت سید محمد علی شاہ صاحب سے بخوبی واقف ہیں لیکن جناب میکش سے قطعاً ناواقف اور جناب میکش سے مکمل طور پر متعارف لیکن سید محمد علی شاہ صاحب سے بالکل نا آشنا۔

یہ ضروری بھی نہیں کہ کسی شے کی تمام حیثیات ظاہر ہوں خصوصاً میکش صاحب جیسی نام و نمود سے نافر بلکہ دشمن نام و نمود ہستی جس نے متعدد مقالہ جات و تواریخ جو خاص طور پر "میکدہ" کے لیے لکھی گئی تھیں محض اس جرم میں شریک اشاعت نہ کرنے دیں کہ اُن میں مدحیہ عنصر کافی تھا۔

سرِ مطلب

جناب مولوی، سید، محمد علی صاحب میکش، قادری، نیازی رئیس میوہ کٹرہ "آگرے" کے ایک ایسے مشہور و ممتاز خاندان کے فرد بزرگ ہیں جو بلحاظ شرافت و نجابت اور بحیثیت تقدس ظاہر و باطن اپنا جواب نہیں رکھتا اور چونکہ گزشتہ صدی عیسوی میں حامل عنانِ نظم و نسق شہر بھی رہ چکا ہے اس لیے قریب قریب تمام دینی و دنیاوی وجاہتوں کا طرۂ امتیاز اپنے سر پر لگائے ہوئے ہے اور یہی وجہ ہے کہ آگرہ کی کوئی تاریخ، کوئی قدیمی خاندان اور کوئی شخصیت ایسی نہیں جو انتہائی عظمت اور دلی محبت کے ساتھ اس گھرانے کا نام نہ لیتی ہو۔ 1

مذہبی تقدس کے اعتبار سے بھی موصوف کے جدامجد حضرت سید امجد علی شاہ اصغر رحمتہ اللہ علیہ جد بزرگوار حضرت سید مظفر علی شاہ اللہی "مؤلف جواہر غیبی" طاب ثراہ، اور والد ماجد حضرت سید اصغر علی شاہ اعلی اللہ مقامہ مرجع خواص و عام و سرآمد روزگار رہے ہیں۔

چونکہ "آگرے" کے تمام "سجادگانِ خصوصی" کا سلسلۂ ارادت آپ کے جد امجد مولوی سید امجد علی شاہ رحمتہ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے اس لیے اس آستانہ کی جبیں سائی "ارض تاج" میں علی العموم باعث فخر و مباہات سمجھی جاتی ہے۔ اور جناب میکش مسلم طور پر اس خاندان کے وارث اور جانشین مانے جاتے ہیں۔

---

1 ملاحظہ ہو "تذکرہ الٰہی، انوار العارفین، تحفۂ طہران، سادات الصوفیہ، مشاہیر اکبرآباد، تذکرہ گلشن بے خار، نسب مصوری، وغیرہ۔"

میرا مقصد اس خاندان کی تاریخ نویسی نہیں بلکہ مجھے ان اسباب پر روشنی ڈالنا مدنظر ہے جن کا اثر جناب میکش کی شاعری پر ہوا اس لیے کہ ہر انسان کے ذاتی کیریکٹر کے علاوہ ایک خاندانی کیریکٹر بھی ہوتا ہے جو طوعاً وکرہاً ماحول سے بنتا ہے اور شخصی کیریکٹر کو متاثر کیے بغیر نہیں چھوڑتا بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غالباً ناموزوں نہ ہوگا کہ ذاتی کیریکٹر کی داغ بیل خاندانی کیریکٹر کے ماحول میں پڑتی ہے اور شخصی کیریکٹر کی تعمیر میں اس کے آثار ضرور پائے جاتے ہیں۔

جناب میکش کی ولادت مارچ 1902 میں ہوئی۔ دو سال کی عمر میں سایۂ پدری اور بزرگانِ ذکور کی سرپرستی سے محروم ہو گئے اور آپ کی تعلیم و تربیت آپ کی والدہ ماجدہ کی زیر نگرانی ہوئی جو ایک باہوش اور صالحاتِ قدیمہ کی زندہ یادگار ہونے کے علاوہ بزرگانِ خاندان کے علم و عمل سے بخوبی واقف ہیں اس لیے اُنہوں نے اپنے محبوب بیٹے کی تعلیم کے لیے شہر و بیرون جات سے بڑے بڑے لائق علما فضلا کی علمی خدمات بیش قرار معاوضوں پر حاصل کر کے ابتدائی و اوسط مراحل علیہ مکان ہی پر طے کرائے اور انتہائی مدارج کی تکمیل کے لیے آپ کو مدرسہ عالیہ (جامع) آگرہ میں داخل کرا دیا، جہاں سے آپ نے انیس سال کی عمر میں علوم ظاہری کی سند حاصل کی اور 1921 میں آپ کا سر دستارِ فضیلت سے مزین کر دیا گیا۔ گو ''درس نظامیہ'' کے مرممہ نصاب کے مطابق آپ نے منقولات کے دوش بدوش جدید و قدیم معقولات کا درس بھی لیا ہوتا ہم چونکہ اپنی خاندانی روایات و ضروریات کے مطابق آپ سجادہ نشین بھی ہوئے اس لیے مطالعہ علوم و فنون اور شریعت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی پابندی کے ساتھ ساتھ صفائی قلب اور علم باطن کا حصول ہمیشہ مطمحِ نظر رہا لہٰذا ''علمائے ظاہر'' کی سی ''خشکی'' اور ''پیرزادوں'' کی سی ''صنعت'' آپ میں پیدا نہ ہو سکی۔ تنہا نشینی اور تعلیمات ظاہر و باطن کا اثر آپ کی شاعری پر بہت گہرا پڑا ہے، یہی وجہ ہے کہ آپ کا کلام کورانہ تقلید سے سراسر مبرّا ہے، عرصہ تک ''ادبی مجلسوں'' اور ''مشاعروں'' سے آپ کی قطعی بے تعلقی نے آپ کے اس وصف کو اور بھی نمایاں کیا ہے۔

آپ ''انگریزی تعلیم و زبان'' سے ناآشنا ہیں اس لیے ''مغربی خیالات'' اگر کلام میں ہوں تو اُنھیں اتفاقات سے سمجھنا چاہیے۔ ہم اس سے پہلے کہیں بیان کر آئے ہیں کہ عہد طفولیت ہی میں آپ کے سر سے پدر بزرگوار کا سایہ اُٹھ گیا تھا اس لیے کمسنی ہی میں

آپ کی نیا بنا ایک بزرگانہ شخصیت قائم ہوگئی لہٰذا ابتدا ہی سے آپ کے کلام میں (جس کا ذوق آپ کو وراثتاً حاصل ہوا ہے) متانت و سنجیدگی موجود ہے اور خودداری و عزِ نفس کا عنصر بہت نمایاں ہے۔

پھر ایسی ''قیود'' میں ''عشق و محبت کا مطالعہ'' جو فطرت کائنات'' ہے کس نظر سے کیا گیا ہوگا؟ ہر شخص اندازہ نہیں کر سکتا۔ ضرور ہے کہ ''صنعت'' ''وفطرت'' یا ''عشق'' و ''عقل'' کی جنگ ہوتی رہی ہوگی۔ آزادی کا جذبہ مغلوب ہو کر غالب آنے کی کوشش کرتا رہا ہوگا، نتیجہ کیا ہوا؟ ''خدا ہی بہتر جانتا ہے'' مگر شاعری تمام تر یہی کہتی ہے کہ آزادی اور پابندی دونوں جذبوں نے مادیت کو شکست دیدی اور

باطنم آزاد مطلق ظاہرم در قید و بند

کا نظریہ عملی طور پر قائم ہو گیا۔ ورنہ کس طرح ممکن تھا کہ جناب میکش اپنے خاندانی عزت، ووجاہت سے قطع نظر کر کے در ''خانقاہ'' عالم پناہ'' بریلی'' شریف پر حاضر ہو کر وہاں بصد نیازمندی واکتسابِ ''علوم باطنی'' کرتے۔ انھیں امور کی بنا پر ''پیرزادگان'' کے ''امراض خصوصی'' سے موصوف بحمد اللہ یکسر پاک اور سادگی، صداقت و آزادخیالی کے صفات سے متصف ہیں اور ان کا یہ شعر ان کی ان کیفیات کا جام جہاں نما ہے۔

خاکساری بھی ہے ریاکاری ہستی غیر کا نقاب اُٹھا

''صاحب میکدہ'' سے گو نا کافی سہی مگر یک گونہ ''تعارف'' ہو گیا اب ''مے میکدہ'' کی کیفیات کا مشاہدہ اور اُن سے لطف اندوز ہونا باقی ہے۔ اگر بالاستیعاب تمام کیفیات پر روشنی ڈالی جائے تو میں اپنے دائرۂ مقصد سے نکل کر میدان ''تبصرہ'' میں گامزن ہو جاؤں گا اس لیے صرف اُن امور کی جانب اشارہ کر دینا مناسب سمجھتا ہوں جو نمایاں طور پر جناب میکش کی ''حدود شاعری'' کو ''رفتار حاضرہ'' سے بالکل علاحدہ اور نمایاں تر کر دیتے ہیں۔

(1) ذیل کے اشعار بزبانِ حال گویا ہیں کہ ''میکش صاحب نے عاشقیت کی نہیں بلکہ معشوقیت کی ترجمانی کی ہے۔''

میں خود معنیٔ حسن ہوں اے ستمگر مگر کچھ جدائی میں تیری مزا ہے

بتا دیں آپ اپنے دوستوں کے نام تو مجھ کو — سمجھ تو لوں کہ میرے کتنے دشمن ہیں زمانے میں
یہ تم دشمن کی جانب دیکھ کر کیا مسکراتے ہو — ہمیں خود اعتبارِ وعدۂ فردا نہیں آیا
جم گئی دل میں اس کو بھی محبت تجھ سے ہے — تیرے سودائی کو دشمن سے محبت ہوگئی

(3) ''آزادی'' اور ''عزِ نفس'' کی کیفیات شعریت کے قالب میں ملاحظہ ہوں ۔

آزادِ دو جہاں ہوں ہاں تم برا نہ مانو — میں نے تو ایک فقرہ رندانہ کہہ دیا ہے
تھی فنا تو مرا مقام مگر — نہ رہے تم بھی جب حجاب اُٹھا
میں سہی صرف یک نظارہ حسن — اور جو پہنچے مرا نقاب اُٹھا
یہ بیخودی شوق تو ہے اور شے مگر — رہتے ہیں ہم بھی آپ کو اکثر لئے ہوئے
زلفِ مشکبو کا غم دل کو وقف کیوں کر لے — دل کو جو کرے برہم زلفِ مشکبو ہی ہے
تو کیا جانے تو کیا سمجھے رنگِ محفل واپِ مجلس — زیبائش یک محفل تو ہے آوارۂ صد محفل میں ہوں
محبت کو میری غرض تم سے کیا ہے — طبیعت کا دل کی یہی مقتضا ہے

(4) ''عام مسلمات شاعری'' سے جناب میکش کا زاویہ نگاہ اختلافِ عظیم رکھتا ہے اشعار محولہ بالا تو خیر اس امر خاص پر روشنی ڈال ہی رہے ہیں مگر چند تمثیلات اور ملاحظہ ہوں ۔

سہتے سہتے غم محبت کے یہ حالت ہوگئی — ہنس کے بولا جو کوئی اُس سے محبت ہوگئی
خوش رہو دُنیا میں تم ہم تو اسی میں شاد ہیں — تم سے مل کر رو لیے ہلکی طبیعت ہوگئی
ستاتا ہے مجھے گو تیرا اندازِ ستم لیکن — قیامت وہ ہے جب تو رحم پر مجبور ہو جائے
تجھ سے بھی کچھ فزوں ہے مرا دل سے واسطہ — تو انتخابِ عشق ہے دل انتخابِ حُسن
خلش خارِ تمنا کی ہے وجہ زندگی مجھ کو — وفا کا کیا کروں شکوہ جفا بھی آپ نے کم کی
چراغِ طور کیا ہے گل چراغِ طور ہو جائے — وہ کیا جلوہ ہے جو پابندِ سمت و نور ہو جائے
حق و باطل کا امتیاز یہ ہے — امتیازات کے حجاب اُٹھا
خاکساری بھی ہے ریا کاری — ہستی غیر کا نقاب اُٹھا
بدلا ہے اے شکوۂ دل کیا معیار تمنا کا — ورنہ جیسی پہلے تھی اب بھی اُنکی عنایت ہے
ثابت ہوا یہ ہے ترا انداز مستقل — دل سے تری نگاہ کرم کا گماں گیا

تیرے ستم کا کیا شکوہ تیرے کرم کا کیا کہنا
جب بھی دل میں حسرت تھی اب بھی دل میں حسرت ہے

(5) میکش کی ایک بڑی خصوصیت حقیقت نگاری بھی ہے جس کے ضمن میں آپ ایسے عجیب وغریب اشعار دیکھیں گے جو یقیناً فقید المثال ہیں۔ اس قسم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

تو حقیقت کل ہے وہم غیر ہے باطل — بلکہ وہم باطل بھی حق تو یہ ہے تو ہی ہے
آبرو جسے کہیے کچھ نہیں بجز پندار — یاں شکست ہر پندار اپنی آبرو ہی ہے
جس جگہ نظر ٹھہرے وہ حجاب ہے اُس کا — دے نظر کو آزادی پھر وہ روبرو ہی ہے
میں اور یہ تنزل میں اور عشق صورت — آئینہ ڈھونڈتی ہے کیفِ خودی کی فطرت
میں عشق کا ہیولا اور شکل میری تم ہو — باطن میں میں ہی میں ہوں ظاہر میں تم ہی تم ہو

خوشی کی جستجو اے دوست غم ہے — خوشی کو بھول جا غم بھی نہ ہوگا
غایت قرب ہوا وجہ حجاب — کاش کچھ دور وہ ہم سے ہوتا
کیا مجھ کو گمرہی عالم کا غم نہیں ہے — لیکن میں سن رہا ہوں کچھ عذر بیخودی کے
اے محوِ سازِ شادی سن میرا سوزِ غم بھی — سمجھانا چاہتا ہوں معنی تجھے خوشی کے

(6) بیانِ ''کیفیات'' و ''محاکات'' بکثرت اور ایسے ''معجز نما انداز'' سے آپ کو نظر آئے گا کہ آپ کو جناب میکش کی ''انفرادی حیثیت'' تسلیم کرنا پڑے گی۔ اشعار ذیل توجہ طلب ہیں۔

مرے دل کی بھی عمر اتنی ہی تھی — ترے لب پہ جتنا تبسم رہا
گریۂ نا تمام عیب نہیں — آپ ہنسنے کو میرے کیا سمجھے
تقاضا دردِ دل کا ہے کہ لیکر مجھ کو اُڑ جائے — جسے کہتے ہیں نالہ کوششِ ناکام ہے رم کی
کچھ اس طرح ہوئیں تقسیم شوخیاں ان کی — ہر ایک نے یہی سمجھا ادھر کو دیکھتے ہیں
تم نے دکھائی ہیں وہ چرا کر نگاہ کو — جو شوخیاں کہ چھوٹ گئی تھیں نگاہ سے
مانا کہ شانِ حسن ہیں بے التفاتیاں — تیری طرف نہ دیکھ رہا ہو میں جب تو دیکھ

قہر آلودہ نگاہیں تری کچھ غیر نہیں   آج ناراض ہے خود میری طبیعت مجھ سے
تم نے کیوں ناز سے مجھے دیکھا   اب مجھی پہ نظر ہے محفل کی
گم ہو گیا حقیقت وعدہ میں مدعا   کچھ یاد ہو تو اُن سے تقاضا کرے کوئی
تغافل سے فزوں ہے گو غم دل   ترحم سے ترے کم بھی نہ ہوگا

کس ادا سے ترا نقاب اُٹھا   فرقِ تسکین و اضطراب اُٹھا
اللہ اللہ ترے حسن کی شہرت یعنی   میری رسوائی سے خالی نہیں محفل کوئی

مثالیں شاید بہت زیادہ ہو گئیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر سلسلۂ کلام یوں ہی جاری رہا تو سارا دیوان اسی طرح ختم ہو جائے گا۔

مجھے اس کا بہت احساس ہے کہ باوجود سعی و توقع میں کچھ نہ لکھ سکا خصوصاً نثر پر تو بالکل ہی توجہ نہیں کر سکا۔

ع   بپایاں آمد ایں دفتر حکایت ہمچناں باقی

مگر اس امر کو تنہا میری "نا قابلیت" ہی پر محمول نہ کرنا چاہیے بلکہ جناب میکش کی "بلند مقامی" بھی اس کی بہت کچھ "خطاوار" ہے۔

بہر حال "میکدہ" کے مطالعہ کرنے والے کو یہ بات کبھی محو و فراموش نہ کرنی چاہیے کہ اس کے سامنے ایک ایسے شاعر کا کلام ہے جو "مادیات" سے بہت بلند ہے اور جس کا کلام تمام تر "ورائے شاعری چیز دگر ہست" کا مصداق ہے۔

میں اس دورِ کیف میں یہ عرض کرنا ہی بھول گیا کہ "جناب میکش کو اتفاق سے کسی سے شرف تلمذ حاصل نہیں"

اور ہاں! خوب یاد آیا   اس معاملہ میں خود ان کے ذاتی الفاظ یہ ہیں۔

"میں جیسا ہوں، ویسا ہی پبلک کے سامنے آنا پسند کرتا
ہوں، اپنے عیوب کو اصلاح کے پردے میں پوشیدہ
کرنا کیا فرض ہے"

آپ کہا کرتے ہیں ''میرا کوئی شاگرد نہیں'' اور جو لوگ آپ سے اصلاح لیتے ہیں اُن کے حق میں ارشاد ہوتا ہے'' یہ ''مخصوص احباب ہیں، مجھ سے مشورہ کرلیا کرتے ہیں'' درحقیقت یہ سیکش صاحب کے کسر نفسی ہے ورنہ ان میں وہ تمام کمالات موجود ہیں جن سے بہت سے مدعیان ''اُستادی'' خالی ہیں میرے خیال میں ارباب رسائل واخبارات سے خود کو ''علامۂ وقت، ابوالفخر، سحر نگار، ابوالبیان اور لسان الہند وغیرہ وغیرہ لکھوا کر از روئے ''پروپیگنڈا'' استاد بننے اور حقیقتاً استادانہ شان پیدا کرنے میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔

جناب میکش کا ایسا کچھ فرمانا بھی اُن کی نجابت اور عالی حوصلگی کی دلیل ہے۔ جب آپ کے جد نامدار (روحی فدا) نے ''قاب قوسین اوادنیٰ'' کے مرتبہ پر فائز ہوکر ''ماعرفنک حق معرفتک'' فرمایا تو وہ ایسا نہ کہیں؟ اب یہ دوسری بات ہے کہ جس طرح وہاں صاحبانِ نظر ''حق معرفت کی قید سے سب کچھ سمجھ لیتے ہیں یہاں ''مشورہ کی پابندیاں بہت کچھ بھا دیتی ہیں۔

1930 کے وسط میں ''میکدہ'' طبع ہو چکا تھا اس لیے 1929 تک کا کلام اُس میں شامل ہے لیکن بعض وجوہ سے اشاعت میں تاخیر ہوتی گئی آخر 1930 بھی ختم ہو گیا اور اس عرصے میں جناب میکش نے جو کچھ لکھا وہ شامل ''میکدہ'' نہ ہو سکا لہٰذا اس کو بعد تعارف نقل کیے دیتا ہوں۔

1930

جبیں اک آسماں بھی ہے زمیں پر — قدم رکھیے مری خاکِ جبیں پر
رکھا ہے لطف بے مدعا نے — مدارِ آرزو اُن کی نہیں پر
ہے خوں تمکین شوقِ سادہ دل کا — تری چشم تبسم آفریں پر
گماں ہونے لگا اے جبر وحشت — مرے دامن کا اُن کی آستیں پر
تمہارا در ہے ہم بھی جانتے ہیں — مگر اب آن بیٹھے ہم جبیں پر
جس کو پورا نہ آپ کھینچ سکے — رہ گیا ہے وہ تیر دم ہو کر
وہ خوشی جس پہ تھا مدارِ حیات — دل میں آتی ہے آج غم ہو کر
کہیں کیونکر فریب کارِ ہستی — بہ مجبوری یہاں مختار ہیں ہم
یوں تری دشمنی ہے دل کو عزیز — جس طرح گرمیاں ہوں جاڑوں میں

میں ہوں یوں زیبِ خانہ ویرانی   ہو شفق جس طرح پہاڑوں میں

کے لیے یہ شاد رہے گا دل اپنا کیا شاد کرو
جس نے چھینی راحتِ دل بہتر ہے اُسی کو یاد کرو

تم بھی تماشہ دیکھ چکے بستی بھی تم سے تنگ ہوئی
بس اب آنکھیں بند کرو اور ویرانہ آباد کرو

سب کچھ گر تم ہو نہ سکو اور غیرت ہے تو کچھ بھی نہ ہو
خود دنیا ایجاد کرو یا اپنے کو برباد کرو

عاشقِ سر مست و رسوا دیدۂ   اندریں آئینہ خود را دیدۂ
دیدِ خود را نیز گم کن جانِ من   اے کہ حق را آشکارا دیدۂ
کہاں کا قصد ہے او مست جامِ بیخبری   دلوں کو نرم نگاہوں کو آشنا کرکے
اگرچہ عشق ہے خود التجائے سوزِ خودی   مگر ذلیل ہوئے تم سے التجا کرکے
تمھیں بھی زحمتِ تصدیقِ عذر دی میں نے   ذلیل خود بھی ہوا تم سے التجا کرکے
غلط نصیحت تمکیں کہ عارضی ہی سہی   سکون ہو تو گیا عرضِ مدعا کرکے

بعد کشتن بھی گماں کرتا ہے تو بسمل مجھے   اپنی صورت سے ملا کر دیکھ اب قاتل مجھے
مجھ کو دُنیا نے بہت پایا مگر کھویا ہوا   تھی وہیں خلوت جہاں یاد آئی وہ محفل مجھے
میں دلیلِ مدعا ہوں میں جوابِ ہر دعا   حاصل کون و مکاں ہوں کچھ نہیں حاصل مجھے
مجھ سے منزل کا تعین مجھ سے منزل کا وجود   چاہے گر اپنے کو پانا ڈھونڈھ لے منزل مجھے
بیخودی میری تری بیگانگی مہمل نہیں   دے رہی ہے دعوتِ خلوت تری محفل مجھے
دیر تک بنتا رہا غافل میں با اعلانِ سوز   دیر تک دیکھا کیا وہ جان کر غافل مجھے

تیرے جلوے کی عنایت یا مرے دل کا قصور   آج ہر ذرّہ نظر آیا جوابِ دل مجھے
مرحبا میکش تری دیوانگی مقبول ہے
بوئے جاں آتی ہے تجھ میں سے بہ ربِ دل مجھے

حقائق

عرصہائے گوشِ شور ہاؤ ہو پر تنگ کر   پردہائے چشم نذرِ جلوۂ بیرنگ کر
نغمہ ہائے معرفت سے دل کو ہم آہنگ کر
آپ سے بیگانہ رہنا ہی ہے اصل اختلاف
عیش ہائے وصل ہیں تمہید ہائے فراق   خلوتِ جاوید کو مت کر صرفِ بزمِ اشتقاق
اجتماعِ بزم کے معنی ہیں تجدیدِ نفاق
اتفاق اے مہرباں خود ہے بنائے اختلاف
کس کو کرتا ہے مخاطب کچھ تجھے معلوم ہے   قوم کہتا ہے جسے اُس کا تو ہی مفہوم ہے
یعنی بے افراد کے مجموعہ خود معدوم ہے
عیب جوئی چھوڑ دے کر پہلے اپنا انکشاف
دوسرے کیوں جوش میں ہیں اس پہ تجھ کو جوش ہے   ہوش کی دیتا ہے دعوت اور خود بیہوش ہے
تو اگر خاموش ہو جائے جہاں خاموش ہے
اختلافوں کو مٹانا بھی تو خود ہے اختلاف
ضد سے ہی عرفانِ شے ہے اے دوست یا تحصیلِ شے   کس طرح تنقیصِ شے سے ہو سکے تکمیلِ شے
جمعِ شے مقصد ہے اور تحتِ عمل تحلیلِ شے
کیوں تلاشِ امن میں رہتا ہے مصروفِ مصاف
تجھ میں پنہاں ہے حقیقت اور تو دیوانہ وار   ہے تلاشِ مشک میں مانندِ آہوئے تتار
غیر بینی چھوڑ خود بینی بنا اپنا شعار
آئینہ مت ڈھونڈ کر لے قلب کا آئینہ صاف

اپنی ہی تحریک ہو اور اپنی ہی تائید ہو　　　عیب ہے تقلید تو مغرب کی کیوں تقلید ہو

کامیابی گر کسی کو ہو تجھے کیوں عید ہو

غیر مصروفِ عمل ہیں تو ہے سرورِ گزاف

ناچیز

محمد عبداللطیف خاں کشتہ قادری

(منشی فاضل ایچ۔پی۔پی۔ایل۔ای

صاحب "حیاتِ عزیز" و "تختِ طاؤس")

معلم السنہ مشرقیہ

گورنمنٹ ہائی اسکول۔ مین پوری

مرقومہ 12-جنوری 1931

حرف چند

اکبرآباد صدیوں سے شعروادب کا گہوارہ رہا ہے۔ یہاں پر سحاب علم ٹوٹ ٹوٹ کر برسا ہے۔ یہاں کے ابر گہر ہائے آبدار کشت شعروسخن کی آبیاری میں اہم کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ خان آرزو سے لے کر میر اور پھر میر سے لے کر غالب و نظیر اکبرآبادی اور ـــــ میکش اکبرآبادی تک ایک شعری کہکشاں ہے جو مطلع ادب پر اپنی رعنائیوں کو پیش کرتی رہی ہے۔ تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں۔ عرض ہ ق، یہ کرنا ہے میکش اسی سرزمین پر طلوع ہوئے اور بساط شعروسخن پر چھا گئے۔ ان کا پورا ام سی ٔ علی شاہ اور تخلص میکش ہے اور سلسلہ نسب 31 واسطوں سے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ملتا ہے۔ یہ ابھی پونے دو سال کے ہی تھے کہ ان کے والد کا اچانک انتقال ہو گیا۔ میکش اکبرآبادی کے چھوٹے بھائی احمد علی شاہ جعفری اس وقت تین ماہ کے تھے۔ حضرت میکش کے والد ماجد کا انتقال اچانک ہوا اور ایک بیوہ اور صرف دو معصوم بچے تھے اس لیے جائداد اور اثاثہ سب نذر حادثات ہو گیا۔ اس ذیل میں میکش کا بیان بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ فرماتے ہیں:

''سارے شہر میں ان کے والد کی جواں مرگ اور اچانک موت پر کہرام مچا ہوا تھا، جو سنتا تھا بدحواس ہو کر دوڑا چلا آ رہا تھا مگر قریب کے عزیزوں کو رونے کی بھی فرصت نہیں تھی۔ سارے

کاغذات اور گاؤں کا حساب خرد برد ہو گیا تھا۔ جس پر ''میاں'' کا روپیہ واجب تھا اس سے ہم محروم ہو گئے اور جس جس کی امانتیں ''میاں'' کے پاس تھیں ان کی ادائیگی ہمارے ذمے واجب ہو گئی۔''[1]

میکش، والد ماجد کے انتقال پر ملال کے بعد آلام و مصائب میں گرفتار رہے لیکن پرورش لوح و قلم میں بدستور معروف اور مشغول رہے اور ان کے مجموعہ ہائے کلام یکے بعد دیگرے منظر عام پر آتے رہے۔ ''مے کدہ'' 1931، ''حرف تمنا'' بار دوم 1955، ''داستان شب'' 1979 میں اشاعت پذیر ہوئے۔ اردو نثر میں بھی ان کی دو اہم تصانیف ہیں ''نقد اقبال'' اور ''مسائل تصوف''۔ جن کی علمی و ادبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی ہوئی۔ یہ دونوں تصانیف گراں قدر افکار و نظریات کی حامل ہیں۔

میکش اکبر آبادی ایک صوفی شاعر تھے لیکن ان کا تصور روایتی نہیں تھا یوں تو انھوں نے نعت، منقبت، غزل اور نظم وغیرہ میں طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن ان کی شعری توانائیاں ہر صنف سخن میں جلوۂ صد رنگ پیش کرتی ہیں۔ وہ تصوف کو تغزل کے پیانے میں ڈھالنے کا ہنر جانتے تھے۔ ان کی کشادہ ذہنی اور وسیع المشربی شعر و ادب کو برگزیدہ بناتی ہے۔ وہ غزل کے موضوعات کے رمز شناس تھے۔ غزل کی دروں بینی اور رمزیت ان کی شاعری کی روح ہے۔ تخیل اور جذبے کو بہت ہی فنی نزاکتوں سے مربوط کرتے ہیں۔ حسن و عشق کے معاملات اور راز درون پردہ پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ غم عشق اور عشق حقیقی کی جملہ کیفیات کی ترجمانی ان کی شاعری میں بھرپور انداز سے جلوہ گر ہے۔

یہ بات مسلم الثبوت ہے کہ انسانی ذہن و وجدان (Vision) کی ساخت اور تعمیر و تشکیل کچھ اس انداز کی ہے کہ مجاز اور حقیقت کو ایک دوسرے سے ممیز اور ممتاز کرنا دشوار گزار مرحلہ ہے۔ یہ دونوں توام ہیں۔ جیسا کہ لسان الغیب حافظ شیرازی کا ارشاد ہے ؎

ما در پیالہ عکس رخ یار دیدہ ایم
اے بے خبر ز لذت شراب مدام ما

ارباب ذوق نظر اور اہل نظر کو مجاز میں حقیقت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ وہ وحدت کائنات میں یقین رکھتے ہیں۔ ''حرف تمنا'' کے دیباچہ میں رقم طراز ہیں:

1۔ نقوش — آپ بیتی نمبر جلد دوم، ص: 1991

''یہ اتفاق ہے کہ میرا نظریہ اور عقیدہ وحدت کائنات ہے جس میں یہ صلاحیت کہ وہ تمام ترقی پسند نظریات سے ہم آہنگ ہو سکتا ہے اور متضاد نظریات میں صلح کرا سکتا ہے۔ کیونکہ یہ نظریہ تمام کائنات سے محبت سکھاتا ہے۔ کائنات کو حسین تر بنانے کی ترغیب دیتا ہے۔ اس کی رو سے مجاز اور حقیقت، مادہ اور روح یا شعور ایک ہی شے کے مختلف مظاہر ہیں۔''[1]

ہنگامۂ ہستی کے شب روز، حسن و عشق کے معاملات اور ان کی دل کش ادائیں اور دل فریبیاں عجب کشمکش کا عالم پیدا کر دیتی ہیں۔ میکش فرماتے ہیں:

آپ کا انجان پن بھی ایک فن
اور میری عقل و دانش بھی جنوں
ہے زمانہ اپنے غم میں مبتلا
کس سے میکش جا کے اپنا غم کہوں

میکش نے مجازی حقیقت کو پیکر شعر میں خوبصورتی سے ڈھالا ہے:

وہ گیسوؤں سے ہوش گنوانا ہوا تمام
وہ آنچلوں سے ہوش میں آنا گزر گیا
جب ایک جستجو کے سوا کام ہی نہ تھا
وہ فرصتوں کا عہد شبانہ گزر گیا

غم زیست کو غم عشق میں برتنا بھی فن کار کی فنی ریاضت اور ذہانت کا کام ہے۔ میکش ایک مکمل فلسفہ رنج و مسرت کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

یہ مانا زندگی میں غم بہت ہیں ہنسے بھی زندگی میں ہم بہت ہیں
نہیں ہے منحصر کچھ فصل گل پر جنوں کے اور بھی موسم بہت ہیں

رنگ و بو کے شعری محرکات بھی میکش کی غزلوں میں نمایاں ہیں۔ اگر غور و فکر سے کام لیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ غزل ایک طلسماتی پیکر ہے:

---

1. حرف تمنا — ص، ج، ص، د

کیسے کہہ دوں کہ کوئی زینت آغوش نہ تھا　　اک ثبوت اس کا یہی ہے کہ مجھے ہوش نہ تھا

تھا قیامت کا نہ ہونا بھی قیامت مجھ کو　　دل ستم کوش تھا جس دم وہ ستم کوش نہ تھا

دراصل غزل محویت، سرشاری اور بے خودی کی شاعری ہے۔ جب تحت الشعور کی یادیں برانگیختہ ہوتی ہیں تو تخیل اپنی تمام تر توانائیوں کے سرمایے کو فن کی نذر کر دیتا ہے:

جب دل نہ رہا تو خوشی نہ رہی جو خوشی نہ رہی نہ رہا غم بھی
جب غم نہ رہا تو خلش نہ رہی جو خلش نہ رہی تو مزا نہ رہا

ترا کل کا وعدہ کیا وعدہ مری آج کی تسکیں کیا تسکیں
تری یاد ہی تو بے رہی نہ رہی مرا ہوش ہی تو بے رہا نہ رہا

وہ آئے اور چلے بھی گئے دنیا کے غموں کو کیا کہیے
مجھے عشق کی کچھ بھی خبر نہ ہوئی، مجھے حسن کا ہوش ذرا نہ رہا

میکش کے یہاں طرز ادا پر کافی زور دیا گیا ہے اور تاثیر لفظی سے ایک کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ ان پر یک گونہ بے خودی اور نشے کی سی کیفیت طاری ہوئی اور اپنی داستانِ ذوق و شوق بیان کرنے میں کافی جذباتی ہو جاتے ہیں۔ جس میں تصوف کے انداز و نیاز محسوس کیے جا سکتے ہیں۔

میکش نے قحط بنگال، دور جنگ، موج طوفاں، ریاکاری، رہبر، مشرق و مغرب، شیخ و رند وغیرہ پر بھی نظمیں کہی ہیں۔ جو ان کے مجموعۂ کلام میں شامل ہیں۔ وہ حسن فطرت کے بھی شیدائی ہیں اس لیے نغمہ حیات چھیڑتے ہیں۔ فتنۂ معصوم، جمال راہنما، بادۂ دوشینہ، شام تنہائی، ''برسات کا دن'' ان کی طبیعت اور شاعری کے تنوع کو پیش کرتی ہیں۔

انسانی اقدار حیات کو پامال ہوتے دیکھ کر وہ بے قرار ہو جاتے ہیں چونکہ وہ وحدت انسانی میں عقیدہ رکھتے ہیں اس لیے یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں:

اہل حرم وہاں ہیں، یہاں اہل دیر ہیں
اب کس سے جاکے پوچھیے انسان کہاں رہے
دیں اگر یہی ہے تو اس سے کفر ہی اچھا
کر دیا پجاری نے قتل دیوتا اپنا

میکش علم و ہنر کی بے حرمتی پر مضطرب ہو جاتے ہیں اور وہ تصوف و اخلاق حسن وعشق کے مرغ زاروں سے نکل کر یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں:

وہی ناقدری ارباب صفا آج بھی ہے
دار و زنجیر صداقت کا صلہ آج بھی ہے

نہیں ہے نظم جہاں کا سنوارنا مشکل
ستم یہ ہے کہ دلوں کا نظام برہم ہے

کہوں گا میں، تو مجھے آدمی کہیں گے برا
کہ مجھ کو تم سے محبت ہے آدمی کی طرح

ان اشعار میں جو اعلیٰ انسانی اور اخلاقی اقدار کے سمندر موجزن ہیں وہ میکش کی شاعری کو زندۂ جاوید بنائے ہوئے ہیں۔ ان کی شاعری کے بہت سے جہات ہیں جن پر اس مختصر تعارف میں احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ اب جبکہ ''کلیات میکش'' ہی زیور طبع سے آراستہ ہو کر آپ کے ہاتھوں میں ہے تو اہل علم وادب خود براہ راست لطف اندوز ہو سکیں گے۔

میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ارباب حل وعقد کا ممنون ہوں کہ انھوں نے یہ کام مجھے تفویض فرمایا۔ قومی کونسل اردو کے نایاب ادب پاروں کو منظر عام پر لانے کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہے۔ کلیات میکش اکبرآبادی بھی اسی کی ایک اہم کڑی ہے۔

کلیات میکش اکبرآبادی ان کے تین مجموعہ کلام پر مشتمل ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

''میکدہ'' یہ پہلا مجموعہ کلام ہے جو 1931 میں زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ حرف اول محمد عبداللطیف خاں کشتہ کا تحریر کردہ ہے۔ ''میکدہ'' کی ترتیب یہ ہے کہ ابتدا سن رواں کے کلام سے ہے اور پھر سلسلہ وار گزشتہ ہوئے سنین کا کلام ہے اس طرح مجموعہ کا اختتام ابتدائی کلام پر ہوتا ہے۔ یہ مجموعہ 1919 سے لے کر 1929 تک کا کلام شامل ہے۔

''حرف تمنا'' یہ میکش اکبرآبادی کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ اس کی ترتیب بھی وہی ہے جو میکدہ کی ہے۔ اس میں 1930 سے لے کر 1955 تک کا کلام شامل ہے۔ جو پچھتر غزلیات، باون نظموں اور پانچ رباعیوں پر مشتمل ہے۔

''داستانِ شب'' یہ میکش اکبرآبادی کا تیسرا مجموعہ کلام ہے جو 1979 میں نامی پریس، لکھنؤ سے طبع ہوا۔ اس مجموعہ کلام میں ایک نعت، چار منقبتیں اور اڑتالیس غزلیں اور دیگر اشعار میں اس میں 1955 سے لے کر 1997 تک کا کلام شامل ہے۔

سید فضل امام

میکدہ

میکش اکبر آبادی کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ جو 1931 میں طبع ہوا۔ حرف اول محمد عبداللطیف خاں کشتہ قادری کا تحریر کیا ہوا ہے۔ میکدہ کی ترتیب یہ ہے کہ ابتدا سنِ رواں کے کلام سے ہے اور پھر سلسلے وار گزرے ہوئے سنین کا کلام ہے۔ اس طرح اختتام ابتدائی کلام پر ہوتا ہے۔ اس میں 1919 سے لے کر 1929 تک کا کلام ہے۔

1929

قیدو اطلاق کا نقاب اٹھا
بے حجابی اُٹھا حجاب اُٹھا

کس ادا سے ترا حجاب اُٹھا
فرقِ تسکین واضطراب اُٹھا

تھی فنا تو مرا مقام ، مگر
نہ رہے تم بھی جب حجاب اُٹھا

میں سمجھی صرف یک نظارۂ حسن
اور جو پہلے مرا نقاب اُٹھا

حق وباطل کا امتیاز یہ ہے
امتیازات کے حجاب اُٹھا

خاکساری بھی ہے ریاکاری
ہستیِ غیر کا نقاب اُٹھا

منزلت جان ہوش کی زاہد
لذت نشہ شراب اُٹھا
سب پہ افسردگی ہوئی طاری
بزم سے میکش خراب اُٹھا

کیا قیامت تھا وہ جلوہ تری رعنائی کا
تجھ سے دیکھا نہ گیا حال تماشائی کا
تذکرہ فرض ہی کیا ہے تری رعنائی کا
سچ تو یہ ہے کہ مجھے شوق ہے رسوائی کا
حیرتِ جلوہ سے چھایا ہے اندھیرا ہر سو
تیرے جلووں میں ہے عالم شب تنہائی کا
مجھ کو غیرت کہ تمھیں دیکھ رہی ہے دنیا
مطمئن تم کہ تماشا ہے یہ سودائی کا
دے نگاہوں کو نہ تکلیف تماشائے جہاں
راز ہے تیری نظر میں مری رسوائی کا
جس سے بیدار ہوا تم میں حیا کا جذبہ
وہ ہی عالم تھا مرے شوق کی رعنائی کا
مطمئن ہوگئے کچھ دیکھ کے آئینے میں تم
تمھیں انداز کہاں عشق کی گہرائی کا
دوست مصروفِ پرستاری خود ہی میکش
معتبر آج نہیں زعم شناسائی کا

5

شب فرقت کی تاریکی میں شامل ہے غبار اپنا
اسی صحرا میں لوٹا عشق نے عہد بہار اپنا

مٹا گلشن تو اُٹھ کر خاکِ گل سے ہم کہاں جاتے
جہاں گلشن تھا پہلے اب وہیں پر ہے مزار اپنا

ترے جلووں میں گم ہوں یا تری فرقت میں مٹ جائیں
یہ ہم سمجھے ہوئے ہیں ہے فنا انجام کار اپنا

ہجومِ یاس میں بیگانگی کا شکوہ کس سے ہو
نہ ہم اپنے نہ دل اپنا نہ جاں اپنی نہ یار اپنا

کہاں اب وہ سرور دور اوّل بزمِ ہستی میں
جسے کہتے ہیں دُنیا ہے وہ اے میکش خمار اپنا

چھا گیا دل پہ اضطراب کا رنگ
ہے مگر یہ ترے شباب کا رنگ

عشق ہی ہے نقابِ جمال
کہہ رہا ہے تری نقاب کا رنگ

شوق میں یاں یہ شانِ تمکیں ہے
واں تغافل میں اضطراب کا رنگ

یاں جوابوں میں ہے سوال کا طور
واں سوالوں میں ہے جواب کا رنگ

یاں نہیں جز ظہورِ یک جلوہ
دیکھ ہر شے میں آفتاب کا رنگ

اس نے دیکھی کمالِ عشق کی شان
جس نے سمجھا ترے شباب کا رنگ
دوست سب کا ہے اور کسی کا نہیں
دیکھنا میکش خراب کا رنگ

دل پہ تو حقیقت حسنِ مجاز ہے
آئینہ عکسِ حیرتِ آئینہ ساز ہے
اے دوست ہے حریفِ فنا خوئے غم مجھے
ہر غمزہ ورنہ قیمت عمر دراز ہے
اے ذوقِ جلوہ چاہیے کچھ امتیاز بھی
کیوں ہر نگاہ پہ در آئینہ باز ہے
یہ انتخاب ضامنِ عصمت ہے خود مگر
میں پاکبازیوں ہوں کہ تو پاکباز ہے
میں شاد ہوں کہ صرفِ یک انداز جلوہ ہوں
میرا جنوں نمائشِ زلفِ دراز ہے
ہوں طالبِ فنا میں بہ عنوانِ ہر جنوں
ہستی مری گناہ محبت کا راز ہے
ہے ہر نگاہ دام محبت لیے ہوئے
کہتے ہیں یہ ہی میکش نظارہ ساز ہے

اعتبارِ منزل کیا ذوقِ جستجو ہی ہے
کامیابی دل کیا، کیفِ آرزو ہی ہے

7

ترکِ جستجو کرکے دل کا مدعا پایا
ترکِ جستجو لیکن فیض جستجو ہی ہے

مے بقیدِ ساغر ہے ہم بقیدِ آزادی
کیفِ سوزِ تنہائی ساغر وسبو ہی ہے

آبرو جسے کہیے کچھ نہیں بجز پندار
یاں شکست ہر پندار اپنی آبرو ہی ہے

تو حقیقتِ کل ہے وہم غیر باطل ہے
بلکہ وہم باطل بھی حق تو یہ ہے تو ہی ہے

زلف مشکبو کا غم دل کو وقف کیوں کر لے
دل کو جو کرے برہم زلفِ مشکبو ہی ہے

جس جگہ نظر ٹھہرے وہ حجاب ہے اُس کا
دے نظر کو آزادی پھر وہ روبرو ہی ہے

یہ فریبِ تسکیں ہے ترکِ آرزو معلوم
ترکِ آرزو میکش یہ بھی آرزو ہی ہے

محبت کو میری غرض تم سے کیا ہے
طبیعت کا دل کی یہی مقتضا ہے

خدا جانے دل کو مرے کیا ہوا ہے
تمھیں سے خفا ہے تمھیں پر فدا ہے

تغافل ہی انجام سے اپنے بہتر
تری بے رخی سے مری ابتدا ہے

میں خود معنیِ حسن ہوں اے ستمگر
مگر کچھ جدائی میں تیری مزا ہے

تمھارا ستم عین میری محبت
کسی پہ کیا تم نے مجھ پہ ہوا ہے

جنوں میرا دونوں جہاں میں مسلّم
تمھیں بھی مگر چھیڑنے کا مزا ہے

میں اس دورِ ہستی میں وہ دائرہ ہوں
کہ ہر انتہا پہ مری ابتدا ہے

نہ کچھ کہہ سکا میں نہ کچھ وہ ہی سمجھے
بہت دیر سوچا کہ کیا مدّعا ہے

مجھے اپنے ہونے کے ہیں لاکھ شکوے
کیا تم سے شکوہ یہ اپنا گلا ہے

ذرا میں نے دیکھا کہ وہ چونک اُٹھے
تُف اے جذبِ دل یہ بھی کیا مشغلا ہے

ہے مردودِ دیر اور کعبے سے فارغ
نہ مومن نہ کافر یہ دل کیا بلا ہے

میں ہر فلسفے کی حقیقت ہوں میکش
مرے سامنے ہیچ ہر فلسفا ہے

میں ہوں لازم اُلفت کو مجھ کو لازم اُلفت ہے
میں ہوں اپنی ضرورت سے مجھ سے میری ضرورت ہے

بعد ہر اک ناکامی کے بڑھتی ہے اُمید مگر
پہلے تمھارا شکوہ تھا اب اپنی بھی شکایت ہے
تیرے ستم کا کیا شکوہ تیرے کرم کا کیا کہنا
جب بھی دل میں حسرت تھی اب بھی دل میں حسرت ہے
بدلا ہے اے شکوۂ دل کیا معیار تمنا کا
ورنہ جیسی پہلے تھی اب بھی اُن کی عنایت ہے
تجھ میں خوئے ستم ہے ہو، دل کو کیوں ہے لذتِ غم
شاید میری طبیعت میں شامل تیری طبیعت ہے
اب تو غم جاں سوز ہی ہے شادیِ دل افروز بھی تھی
آپ کا قبضہ پہلے تھا اب تو ہماری حکومت ہے
یا غم میں بھی لذت تھی یا لذت میں بھی ہے غم
جس کی محبت راحت تھی اُس کا تصور آفت ہے
یا وہ خود بھی میکش تھے یا اب میکش خود ہی نہیں
کس سے شروعِ الفت تھا کس پہ مآلِ اُلفت ہے

جو کی تیری تمنا تو تمنا تھی مجھے غم کی
تمنا سے مگر سازش تری نظروں نے کیا کم کی
نہیں موقوف کچھ ملنے نہ ملنے پر ترے ظالم
مرے دل سے نہ جائے گا یہ فطرت ہے ترے غم کی
تقاضا دردِ دل کا ہے کہ لیکر مجھ کو اُڑ جائے
جسے کہتے ہیں نالہ کوشش ناکام ہے رم کی

تمھیں جب دیکھتا ہوں چاہتا ہے جی کہ مٹ جاؤں
خدا جانے یہ کیفیت مسرت کی ہے یا غم کی

خلش خار تمنا کی ہے وجہ زندگی مجھ کو
وفا کا کیا کروں شکوہ جفا بھی آپ نے کم کی

جو چمکی برق باراں میں جو تڑپی موج طوفاں میں
نظر میں پھر گئیں شانیں کسی کے حسن برہم کی

نہ چھیڑو سازِ عشرت اور تھوڑی دیر دم لے لو
نہ کردے پست نغموں کو صدا میکش کے ماتم کی

دیکھنے پہ ترے موقوف نہیں وحشت دل
تو نہ دیکھے تو یہ انداز بھی قاتل ہوجائے

حیرت جلوہ محافظ ہے خود اے پردہ نشیں
تو چلا آئے تو یہ بزم ہی محمل ہوجائے

تم سے ہوگا نہ تمنائے فنا کا درماں
کاش دل ہی سبب برہمی دل ہوجائے

موت گو ترک تمنا ہو تو آساں ہے مجھے
منتظر یہ ہوں کہ تو ظلم میں کامل ہوجائے

میں ہوں آزاد ہر اک رنگ سے میکش لیکن
دل کو سودا ہے کہ ہر رنگ میں شامل ہو جائے

ترے پردے کا شکوہ تجھ سے یہ بھی چھیڑ ہے ورنہ
سبب جو میرے مٹنے کا ہے وہ ہی وجہ ہستی ہے

خرابِ شانِ استغنائے ساقی ہوں میں اے رندو
مجھے ساقی کو سجدہ بھی خلافِ شانِ مستی ہے

مرے دل اور تیری نظروں میں نسبت ہے برابر کی
تجلّی ایک ظاہر کی ہے اک تصویر مظہر کی
بری حالت ہے سنتے ہیں کسی کے قلبِ مضطر کی
مبارک ہوں تمھیں آرائشیں زلفِ معنبر کی
جسے تقدیر کہتے ہیں وہ ہیں تدبیر کے معنی
جسے تدبیر سمجھے ہیں وہ صورت ہے مقدر کی

اطلاق سے فزوں ہوں تقید سے بری ہوں
گو میں کہیں نہیں ہوں لیکن کہاں نہیں ہوں

بیٹھے ہیں گیسوؤں کو پریشاں کیے ہوئے
میرے جنوں کہ حسن کا عنواں کیے ہوئے

12

مدحت امیر المومنین علیہ السلام

(ناتمام)

ہے تیری ولا علامتِ دیں — جو تجھ سے پھرا ہوا وہ ناری
تو نفسِ رسول ہے سراپا — تفضیل کی بحث خامکاری
تو اور خلیفہ بلا فصل ق — ہے عقل سے مغز جوش عاری
اوّل ہے تو ہی تو ہی ہے آخر — محدود نہیں ہے نور باری
کعبے میں ترا تولدِ خاص — برہان وجودِ پاک باری
میں اور ثنائے پر توِ حق — چارہ بھی نہیں کہ ہوں پچھاری
شاہوں سے فزوں مرا تجمل — یعنی ترے درکا ہوں بھکاری

میکش مرا مرتبہ نہ پوچھو
ہوں پنجتنی و چار یاری

غیرتِ محبت

بیزار سب سے ہے دل تم سے خفا ہے یعنی
پھر ترکِ آرزو کا سودا ہوا ہے یعنی
ہے غیرتِ محبت ناقابلِ تحمل
دُنیا پہ یہ ترحم اور ہم سے یہ تغافل
یہ درد کہتے کہتے گو ہو گیا زمانہ
اے مہرباں مگر اب ہے ختم یہ فسانہ
کرتا ہوں عرض تم سے فرقت کی جب مصیبت
کہتے ہو تم مجھے بھی ہے تم سے سخت زحمت
جب پوچھتا ہوں کیوں ہے اوروں پہ مہربانی
کہہ دیتے ہو "طبیعت" اللہ رے روانی
بولے کبھی نہ منہ سے ہنگامِ مہربانی
اب آ گئی کہاں سے یہ قوتِ بیانی

ثابت ہوا کہ کوئی دل کی دوا نہیں ہے
غم ہے تمھارا لیکن غم میں مزا نہیں ہے
مقصود عاشقی سے تھی دل کو غم کی لذت
روٹھے پہ کس سے کہیے اب رازِ حسن صورت
میں اور یہ تنزل میں اور عشق صورت
آئینہ ڈھونڈتی ہے کیفِ خودی کی فطرت
میں عشق کا ہیولا اور شکل میری تم ہو
باطن میں میں ہی میں ہوں ظاہر میں تم ہی تم ہو
اطلاق میرا عالم، تقیید تم سے رنگیں
مجھ سے فنا کی زینت ہستی کی تم سے تزئیں
تم کیا ہو جو نہ آؤ جذبِ دروں نہیں ہے؟
تکمیل غم ہے لیکن مقصد جنوں نہیں ہے

عقل

ہر ذرے کو یقین کہ میں آفتاب ہوں
شرمندہ آفتاب کہ میں خود حجاب ہوں
ہے مدعی سراب کہ میں عینِ آب ہوں
اور منفعل ہے آب کہ میں بھی سراب ہوں
بیکار ہے یقیں کی طلب عقلِ خام سے
یاں امتیاز صبح کا ہوتا ہے شام سے

حقیقتِ صبح

ہر صبح صبحِ روزِ ازل کا ظہور ہے
ہر اک شعاع حاملِ صد برقِ طور ہے
ایک ایک ذرہ معنیٔ اللہ نور ہے
سمجھیں نہ ہم تو فہم کا اپنے قصور ہے
پردہ اُلٹ کے دیکھ لو شب کی نقاب کا
سارا جہاں ظہور ہے اک آفتاب کا
طوفانِ ضو ہے بحرِ تجلی میں جوش ہے
ہر موجِ نور برقِ تحیر بدوش ہے
اب حسن مستِ غمزہ کو احساس ہوش ہے
انجامِ دل سمجھ کے محبت خموش ہے
ہوتا ہے حکمِ جلوۂ حیرت پناہ سے
دیکھے کوئی نگاہ ملا کر نگاہ سے

صبحِ بہار

آخر شبِ خزاں ہوئی صبحِ بہار ہے   رنگِ شکستِ سلطنتِ زلفِ یار ہے
پھولا اُدھر شفق ہے اِدھر لالہ زار ہے   یہ اُس پہ ہے نثار وہ اس پر نثار ہے
لالے پہ اوس ہے کہ ستارے شفق میں ہیں
دُرِّ عدن مگر کسی لعلیں طبق میں ہیں

ہے منظرِ بہار پہ چھائی بہارِ صبح   گلشن کا ہر شجر ہے گُلِ شاخسارِ صبح
ہر غنچہ ہے حبابِ لبِ جوئبارِ صبح   ہر گُل ہے صرفِ پرتوِ آئینہ زارِ صبح
جوشِ جنوں میں دامنِ شب تار تار ہے
شاملِ بہارِ صبح میں صبحِ بہار ہے

پھولا شفق، ہے آمدِ خور، اب سحر ہوئی   بزمِ فلک پہ لال پری جلوہ گر ہوئی
تارے بڑھے تو ذرّوں کو فکرِ سفر ہوئی   اُٹھے نمازی ختم نمازِ سحر ہوئی
انجم چھپے وہ دور چلے آب و تاب کے
یعنی پیالے ہو گئے خالی شراب کے

نکلی ہے یوں شعاعِ افق کے حجاب سے جیسے کوئی حسین ابھی چونکا ہو خواب سے
ضو کا فریب دور کیا ماہتاب سے دیکھا ہر اک طرف نگہ فتحیاب سے
ہر ذرے کو سبق دیا اللہ نور کا
دے دے کے جس بنایا مکلف ظہور کا

جنگل بسا ہوا ہے ہوا عطر بار ہے سبزہ حریفِ نافہ مشکِ تتار ہے
پانی کی لہریں گیسوئے عنبر فشار ہے طالع ہوئی سحر کہ طلوعِ بہار ہے
ممتاز کرکے فاصلے نزدیک و دور کے
انعام بٹ رہے ہیں نگاہوں کو نور کے

بیداری ہوا میں ہے عالم خمار کا پیدا ہوا سکیں سے مزہ انتظار کا
آئینہ ہے فلک چمن زر نگار کا ہر قطرہ آفتاب ہوا جوئبار کا
غنچوں کے چھیڑنے کو دکھاتی ہیں آئینے
موجیں تڑپ تڑپ کے بناتی ہیں آئینے

اُٹھا غبار افق سے وہ آیا سوار صبح فوج شعاع لے کے بڑھا تاجدار صبح
ہنس کر طیور صبح سے بولی بہار صبح نغموں کے ہار کیجیے نذر نگار صبح
کشتی گل پہ لے کے کٹورا گلاب کا
شبنم چلی دُھلانے کو منہ آفتاب کا

گل کاریوں میں محو ہے قدرت کا باغباں فصل بہار اُدھر اور اِدھر صبح کا سماں
آنکھیں وہ محو دید بتاں ہیں کہ الاماں لینا ہے آج عصمت الفت کا امتحاں
جلووں میں تار تار گریبان ہوش ہے
دل ہے کہ وقف بیخودی مرگ کوش ہے

حُسنِ عمل

ہے جائے عمل دُنیا اور منظر عبرت بھی
کر آپ بھی کچھ، اور دے اوروں کو نصیحت بھی
دُنیا کی محبت ہی ہے اصل بُرائی کی
آغاز میں ذلت ہے انجام میں حسرت بھی
جذبات کی سب قیدیں احساس کے دم سے ہیں
آرام کی گھڑیاں بھی ایام مصیبت بھی
واقع میں نہیں کچھ بھی سب حدِّ نظر تک ہے
آبادی کی رونق بھی ویرانے کی وحشت بھی
افسانہ ہے اور وہ بھی معلوم نہیں کب تک
جمشید کی عشرت بھی قاروں کی دولت بھی
انجام کو دیکھو تو ذلت کی نمائش تھی
فرعون کی عزت بھی نمرود کی سطوت بھی

بے رنگ سے خاکے تھے تصویر جوانی کے
وہ عشق زلیخا بھی یوسف کی صباحت بھی
بیکار ہیں سب باتیں جز حسن عمل غافل
یہ جسم کی زینت ہے اور روح کی راحت بھی

فانی ہے تنِ خاکی ہے روح مگر باقی
ہاں روح بھی باقی ہے اور روح کی حالت بھی
حالت ہے وہی جو کچھ اس جسم میں حاصل کی
عصیاں کی مصیبت بھی اور عشرت عصمت بھی
اچھا ہے تو اچھائی اوروں پہ بھی ثابت کر
تو گل ہے تو لازم ہے گل کے لیے نکہت بھی
کچھ شکر کرم کر بھی انعامِ کرم لیکر
مخلوق کی خدمت کر خالق کی اطاعت بھی
رفعت میں تو بے ہمتا جلوے بھی ترے یکتا
دی عقل بھی خالق نے بخشی تجھے قوت بھی
اپنے سے جو اُلفت ہے لازم ہے غمِ اُلفت
جب آئینہ دیکھے تو، کرلے غمِ سیرت بھی
منشا تری خلقت کا کیا صرف برائی ہے
کیا تیری طرح جاہل ہے صانعِ قدرت بھی
ہر جرم حقیقت میں خود اپنی تباہی ہے
ہر جرم میں شامل ہے خود اُس کی حقیقت بھی
تو جامعِ عالم ہے اوصاف ہیں سب تجھ میں
پوشیدہ ترے اندر ہے نور بھی ظلمت بھی

23

شیطان و فرشتہ کیا، دو نام ہیں یہ تیرے
سرحد میں ترے دل کی عصیاں بھی ہے عصمت بھی
اب یہ تری ہمت ہے چاہے جسے حاصل کر
خود تیری ہی ہستی میں دوزخ بھی ہے جنت بھی
دے دادِ شبابِ دل لے درسِ کتابِ دل
میکش کی غزل بھی سن میکش کی نصیحت بھی

مدارائے ہوس

کیے جا جو ترا جی چاہے میرا کیا ہے دنیا میں
مجھے جانا ہے دُنیا سے تجھے رہنا ہے دُنیا میں
حقیقت کا میں جویا اور تو منکر حقیقت کا
جو خود دشمن ہو اپنا اس سے کیا موقع شکایت کا
جو پابند ہوس ہو راز کیا سمجھے محبت کا
ہے قید جسم سے معیار بالا اپنی الفت کا
تری حد نظر شاہد فروشی کی دوکاں تک ہے
مری پرواز کی وسعت مکاں سے لامکاں تک ہے
میں ہوں پردے کے اندر اور تو پردے کو تکتا ہے
ہے لیلیٰ میرا مقصد اور تجھے محمل پہ سکتا ہے
جو شاہد ہیں زمانے کے مری عصمت کے شاہد ہیں
جو مسجودِ زمانہ ہیں وہ میرے در پہ ساجد ہیں

ستاروں تک نظر تیری میں خود خورشید خاور ہوں
اگر تیرے برابر ہوں تو کافر کے برابر ہوں
ہوس معبود تیرا اور مرا مقصود ناکامی
تجھے لذت بُرا کہنے میں مجھ کو ذوقِ بدنامی
مری بدنامیوں میں ہیں مری آزادیاں پنہاں
مری ناکامیوں میں ہیں مری خود داریاں پنہاں
تری معراج بدگوئی مری تمکین خاموشی
ہے تیرا افترا شیوہ مری عادت خطا پوشی
علاج اپنی برائی کا سمجھتا ہے تو بدگوئی
بھلا تو کب ہوا گر ہوگیا ثابت بُرا کوئی
ترے فقرے ہوئے بادِ شتر بازار طفلاں میں
تجلی بن کے اُتری نظمِ میکش قلب پاکاں میں

تکبر تیری عزت ہے تواضع میری عزت ہے
تری رفعت میں پستی ہے مری پستی میں رفعت ہے
وہ کیا عزت ہے جو حاصل ہو دُنیا کی مذلت سے
وہ جلب نفع کی خاطر ہو یا خوفِ مضرت سے
وہ کیا عزت ہے دیکھیں جس کو اہلِ حق حقارت سے
وہ کیا عزت ہے سمجھے جس کو دُنیا اپنی نسبت سے
حقیقت میں ہر اک پستی کی ہے تعبیر رفعت سے
تعدد پستیوں کا ہے یہاں تعبیر رفعت سے

مری عزت عمل سے ہے مری عظمت ہے محنت میں
مری قوت ہے تقوے سے مری زینت مصیبت میں
مقامِ عشق میں دارو رسن معراج ہے مجھ کو
میں شاہِ دل ہوں طعنِ اہلِ دُنیا تاج ہے مجھ کو
مجھے غلطیدگی خاک وخون ہی شان وشوکت ہے
مجھے گلکاریِ دستِ جنوں ہی زیب وزینت ہے
نہ بڑھ جاتی ہے مجھ میں کوئی شے دُنیا کی عزت سے
نہ ہو جاتا ہے کم کچھ اہلِ ظلمت کی مذلت سے
حقیقت بے نیازِ این وآں ہے این وآں کیا ہے
حقیقت بے نیازِ دو جہاں ہے دوجہاں کیا ہے

مجھے آتا نہیں ہے حال بے معنی سلاموں پر
مکیف میں نہیں محفل میں انگلی کے اشاروں پر
نہ مجھ کو دعویِ علمی نہ مجھ کو لاف عرفانی
نہ کلاہ زینت تقوئی نہ تسبیح سلیمانی
ہے میرا اعتراف جہل دانائی حقیقت میں
غرور بے گناہی ہے گنہگاری محبت میں
جھڑادے اہلِ حاجت سے مرے در کی زمیں بوسی
حسد سے ہو تجھے تسکیں مجھے غم سے سبکدوشی
میں قید رسم سے آزاد ہوں یہ ہے مرا مسلک
میں باطل کے لیے جلاد ہوں یہ ہے مرا مسلک

28

تو بد ہے میں مگر تیری بدی سے بھی نہیں ڈرتا
جو ڈرتا ہے خدا سے وہ کسی سے بھی نہیں ڈرتا

مکمل اپنی آزادی میں ہو کر عین فطرت ہوں
سمجھ کر مجھ کو کچھ کہنا کہ میں تیری حقیقت ہوں

1928

قسمے نیست بہ اغیار زپیمانہ ما
لاالٰہ ست کلید در میخانہ ما
ہست سوز دل ما مطلع دیوان وجود
دین و دنیا ہمہ حرفے ست ز افسانہ ما
ساکنان حرم بیخودی و سرز دیم
بگذر از خویش بیائی چہ بہ کاشانہ ما
نہ نہادہ ست جبیں غیرت ما پیش کسے
با دل خویش مسلم شدہ یارانہ ما
مستی ماست ز فیض شہ جیلاں میکش
اے خوشا بخت وز ہے رفعت پیمانہ ما

تغافل سے فزوں ہے غمِ دل
ترحم سے ترے کم بھی نہ ہوگا

خوشی کی جستجو اے دوست غم ہے
خوشی کو بھول جا غم بھی نہ ہوگا
نہ ہونے کا ہے غم ہونے سے میرے
نہ ہونگا میں تو یہ غم بھی نہ ہوگا
نہیں ہے تنگ دل بے مائگی سے
نہ ہوگا کچھ تو کیا غم بھی نہ ہوگا
مٹے ہم گو جوانی پر تمھاری
کوئی دن میں یہ عالم بھی نہ ہوگا

سودا نظر کا درد جگر کا کہاں گیا
یہ آفتیں بھی ساتھ گئیں میں جہاں گیا
ثابت ہوا یہ ہے ترا انداز مستقل
دل سے تری نگاہِ کرم کا گماں گیا
تنہائی فراق کا قصہ فضول ہے
جب تو گیا یہاں سے تو سارا جہاں گیا
اے یاس دشت ہی کو جو منزل بنایئے
اب یادِ کارواں ہے عبث کارواں گیا
پہچانتا ہے میری نظر کو ہر اک حسیں
مجھ پر بلائیں ٹوٹ پڑیں میں جہاں گیا
اُن کی نظر سے کون کہے دل کا ماجرا
اے حیرتِ خرابی دل میں کہاں گیا
وہ دن کہ جب تھی صحبتِ میکش سرورِ دل
وہ دور وہ زمانہ اب اے مہرباں گیا

جنازہ کشتۂ حسرت کا مرقد کے قریں آیا
نہیں آیا وہ کافر دیکھ لو اب بھی نہیں آیا
مقر ہے بیخودی آنے کی اُس کے اور خلش منکر
تجھے کچھ ہوش ہے ہمدم وہ آیا یا نہیں آیا
ترے سر کی قسم اے دوست ہم ممنون ہیں لیکن
ہماری یاد اب آئی ہے جب دشمن نہیں آیا
نہیں ہے کیا یقیں تم کو مری بیتابی دل کا
مرے سینہ پہ رکھو ہاتھ کیوں اب تو یقیں آیا؟
یہ تم غیروں کی جانب دیکھ کر کیا مسکراتے ہو
ہمیں خود اعتبار وعدۂ فردا نہیں آیا

جلوہائے نقاب نے مارا
اس نمودِ شباب نے مارا
خوں بہا کیا ہے اُن نگاہوں کا
جن کو تیری نقاب نے مارا
جب پڑی تو نظر تمھیں پہ پڑی
صحت انتخاب نے مارا

درد جب بڑھ کر بہ اندازِ فغاں ہوجائے گا
چپ رہوں گا میں تو تو میری زباں ہوجائے گا
بے مری نظروں کے تکمیل تجلی ممتنع
قتل کرکے مجھ کو تو بھی نیم جاں ہوجائے گا

جذب ہونے دو مجھے جلووں پہ پھر تم دیکھنا
ناز معشوقاں نیاز عاشقاں ہوجائے گا

ہے سہل ممتنع مضمون ایسا ایسے عنواں پر
نہیں کی داستاں لکھی ہے میں نے آپ کی ہاں پر
غضب تو نے بتائی اپنی نزدیکی رگ جاں سے
رقابت کی نظر پڑنے لگی میری رگ جاں پر
نہ کیجیے سرد کیف ابتدائے عشق کی گرمی
نظر بیگانہ وش مت ڈالیے مشتاق نازاں پر
تمھیں جلنے سے پروانوں کے ہمدردی نہیں کچھ بھی
ترس آتا ہے کیا کیا گریہ شمع فروزاں پر
مرے دل اور نظر کا اپنی خود ہی تصفیہ کردے
تو کافر ہے مگر ہم چھوڑتے ہیں تیرے ایماں پر
ترے لطف گذشتہ کو بیاں کرتے ہیں وہ آنسو
جو جم کر آج پیکاں ہوگئے ہیں تیر مژگاں پر
قسم ساقی کی میں وہ رند عالم سوز ہوں میکش
کہ دُنیا ایک دھبہ ہے مری ہمت کے داماں پر

نہ پوچھو کس لیے زخم جگر کو دیکھتے ہیں
اس آئینے میں تمھاری نظر کو دیکھتے ہیں
دم فنا تری پہلی نظر کو دیکھتے ہیں
ہم آج شام میں شان سحر کو دیکھتے ہیں

کچھ اس طرح ہوئیں تقسیم شوخیاں اُن کی
ہر ایک نے یہی سمجھا ادھر کو دیکھتے ہیں
شکست دل کا یہاں اب خیال ہے کس کو
تمھاری آنکھوں میں کیفِ ظفر کو دیکھتے ہیں
کہاں کہاں ہے خلش درد کی معاذ اللہ
کہاں کہاں تری ترچھی نظر کو دیکھتے ہیں
بہت بلند ہے میری نگاہ اے میکش
وہ اور ہوں گے جو عیب و ہنر کو دیکھتے ہیں

آ عاشقوں میں بیٹھ فنا عاشقوں سے سیکھ
یہ حسن بھی حجاب ہے اے بے حجابِ حُسن
تجھ سے بھی کچھ فزوں ہے مرا دل سے واسطہ
تو انتخاب عشق ہے دل انتخابِ حُسن
وجدانِ ذوق جلوہ بغیر آئینہ نہیں
یعنی مری نگاہ میں دیکھو شبابِ حُسن
کہتے ہیں جس کو عشق وہ ہے حُسن کا نزول
گویا نہیں سوائے محبت حجابِ حُسن
ہم نے تجھے جو قبلہ اُلفت بنا دیا
یہ حسنِ انتخاب ہے اے انتخابِ حُسن

یوں اپنے وحشیوں کو نہ دیکھا کرے کوئی
کیوں رازِ التفات کو رسوا کرے کوئی

گم ہوگیا حقیقتِ وعدہ میں مدعا
کچھ یاد ہو تو اُن سے تقاضا کرے کوئی
افسانہ کامیابی دل کا نہ پوچھیے
اک قطرہ بھی اگر ہو تو دریا کرے کوئی
کیوں جلوہائے خاص سر بزم عام ہوں
کیوں میرے انتخاب کو رسوا کرے کوئی
دل کو جلا کے خاک نہ کردے وہ نامُراد
کیا فرض ہے کہ تیری تمنا کرے کوئی
دل کو نہیں حقیقت عالم سے کچھ غرض
مطلب یہ ہے خرابِ تماشا کرے کوئی
سب کچھ ہے اور کچھ نہیں میکش یہ حال ہے
میرا سا اعتبار تو پیدا کرے کوئی

قہر آلودہ نگاہیں تری کچھ غیر نہیں
آج ناراض ہے خود میری طبیعت مجھ سے
جانتے ہو کہ یہ بیزار ہے خود آپ سے بھی
ورنہ کیوں کرتے ہو تم میری شکایت مجھ سے
کثرتِ جلوہ سے ہر ذرہ ہے آئینہ سرا
اب تو دیکھی نہیں جاتی مری صورت مجھ سے
چاہتا میں بھی ہوں زاہد کی طرح ترکِ سماع
چھوٹتی ہی نہیں میکش مری فطرت مجھ سے

وہ راز تھا سکونِ خلشِ راحتِ فراق
جو تھی تری نگاہ مکرر لیے ہوئے
کیفِ خودی میں آج میں دُنیا پہ چھا گیا
ہاتھوں میں تیری زلفِ معنبر لیے ہوئے
یہ بیخودیٔ شوق تو ہے اور شے مگر
رہتے ہیں ہم بھی آپ کو اکثر لیے ہوئے
رنگیں بہت تھا عالمِ گم گشتگی کہ میں
چونکا تو دل میں فتنۂ محشر لیے ہوئے
تعبیرِ سوزِ غم سے میں کرتا نہیں مگر
ہے میری ایک شانِ سخنگر لیے ہوئے

ہمیں اچھے نہیں لگتے تماشا دیکھنے والے
تجلی خود نہ کیوں بن جائیں جلوا دیکھنے والے
زہے اے حیرتِ جلوہ تجھی کو مرحبا کہیے
نہ جلوا ہی رہا باقی نہ جلوا دیکھنے والے
یہی ہے اوّل و آخر مسرّت کے فسانوں کا
سن اے میری مصیبت کا تماشا دیکھنے والے
مجھے بے پردہ کرکے آپ جا بیٹھا ہے پردہ میں
نکل پردے سے او میرا تماشا دیکھنے والے

نہ پوچھو حال کچھ حیرت کا برہم رنگِ محفل ہے
نہ وہ تم ہو نہ وہ جلوہ نہ وہ میں ہوں نہ وہ دل ہے

وہ کہتے ہیں محبت اور ہوس میں فرق ہی کیا ہے
نہیں مرتا میں لیکن بات مرجانے کے قابل ہے
مرے دل کی خلش مجھ کو فنا ہونے نہیں دیتی
یہاں ورنہ ہر اک جلوہ مٹا دینے پہ مائل ہے

تم پر ہی طبیعت ہے اُفتادِ طبیعت کی
تم سے ہی محبت ہے تقدیر محبت کی
دیوانہ ہوں میں پھر بھی غیرت ہے شرافت کی
لیکن ترے غصے میں ہے شان مروت کی
تم اور ہو آمادہ اس طرح ترحم پر
قسمت میں تباہی تھی ناکامِ محبت کی
دل نے بھی تمھیں تاکا تم نے بھی جلایا دل
دل نے بھی قیامت کی تم نے بھی قیامت کی
تقصیر جو پوچھو تو میرے ہی جنوں کی ہے
تم نے جو شرارت کی ہے عمر شرارت کی
کچھ دیکھ کے میکش کی اُلفت کا یقیں کرنا
ہر بات میں شوخی ہے اس رند طبیعت کی

کچھ اور بات نہیں تو صحبت حجاب میں ہے
خراب ہونے کی عادت دل خراب میں ہے
تو لا جواب سہی دل کا بھی جواب نہیں
تو انتخاب سہی دل بھی انتخاب میں ہے

بتوں کا عشق ہے کفارۂ گنہ واعظ
شمار اس کا گنہ میں نہیں عذاب میں ہے
بُرائی کچھ مری تقدیر ہی میں ہے ورنہ
وہی جنوں میں ہے جو آپ کے شباب میں ہے
خدا ہی بیکسیِ دل کی آبرو رکھے
شباب تجھ پہ ہے تو عالمِ شباب میں ہے

لو ختم ہوگئے ہم بالیں سے دوست سر کے
طے ہوگئے قضیئے دم بھر میں عمر بھر کے
پوچھو نہ حال دل کا آتا ہے یاد کیا کیا
تازہ ہیں ہر خوشی میں سب داغ عمر بھر کے
ہوش آگیا مکرر بس کر عتاب بس کر
پھر اک نگاہ ہنس کر صدقے تری نظر کے
وہ پچھلی داستانیں کچھ کہہ تو یاد آئیں
ہمدم وہ دن وہ راتیں منظر تھے رہگذر کے
میکش کے دم سے تازہ اگلی شرافتیں ہیں
اب آدمی کہاں ہیں اس دل کے اس نظر کے

حاصلِ صد دل ہے میری نالہ سامانی مجھے
تم پریشاں ہوگئے یہ ہے پریشانی مجھے
وہ تری پہلی نظر اور وہ مری دیوانگی
ایک حیرانی تجھے ہے ًں حیرانی مجھے

تجھ سے کچھ شکوہ نہیں ظالم ترے سر کی قسم
دل پہ کچھ قابو نہیں یہ ہے پریشانی مجھے
جاں بلب ہوں میں تمھیں شکوہ ہے جذبِ حسن سے
بیکسی کی موت مارے گی یہ نادانی مجھے

چراغِ طور کیا ہے گل چراغِ طور ہوجائے
وہ کیا جلوہ ہے جو پابند ست وثور ہوجائے
مجھے منظور ہے جو آپ کو منظور ہوجائے
ستم ہو یا کرم جو کچھ بھی ہو دستور ہوجائے
مری گم گشتگی منزل ہے منزل کس کو کہتے ہیں
خیال آجائے منزل کا تو منزل دور ہوجائے
مٹاتا ہے مجھے گو تیرا اندازِ ستم لیکن
قیامت وہ ہے جب تو رحم پر مجبور ہوجائے
کشاکش وصل وفرقت کی ہے اپنے زعم باطل سے
تمھیں تم ہو جو یکش درمیاں سے دور ہوجائے

تم ہو یا موت کی وفا اس نے
جس کو جینے کا آسرا سمجھے
سادگی ابتدائے اُلفت کی
شوخیوں کو تری حیا سمجھے
گریۂ تا تمام عیب نہیں
آپ ہنسنے سے میرے کیا سمجھے

سجودے بآں مستِ محشر بگاہے
ز میکش زرندے زرِ بادہ جامے
خرابم ازاں چشم میگوں خرابم
بہ ساغر بہ مینابہ بادہ بہ جامے
نمازم ہمیں بس کہ دارم خیالش
سجودے رکوعے قعودے قیامے
غرض آفتِ جانِ محزون مارا
بہ قہرے بہ مہرے سکوتے کلامے
من آں عاشقِ کامیابم کہ دارم
سر دردِ خوابے دلِ دردِ کامے
جنونم بیا فزود امروز میکش
تبسم نگاہے تموّج خرامے

کیفِ خودی

میں کچھ سمجھوں یا کچھ بھی نہیں ہشیار ہوں یا غافل میں ہوں
رہرو میں ہوں رہزن میں ہوں جادہ میں ہوں منزل میں ہوں

یہ معرکہ حسن واُلفت سُرخی ہے مرے افسانے کی
مجنوں میں ہوں صحرا میں ہوں لیلا میں ہوں محمل میں ہوں

ہوتے ہیں عطا نسبت سے مری ہر شے کو یہاں القابِ وجود
دریا میں ہوں کشتی میں ہوں طوفاں میں ہوں ساحل میں ہوں

تو کیا جانے تو کیا سمجھے رنگِ مجلس وابِ محفل
زیبائش یک محفل تو ہے آوارۂ صد محفل میں ہوں

یہ درد کی ساری شکلیں ہیں یہ سوز کی ساری شانیں ہیں
تو کچھ ہو اے شمع محفل لیکن ساری محفل میں ہوں

میں یاد میں تیری روتا ہوں دُنیا مرے حال پہ روتی ہے
بیتاب کہیں یک دل تو ہے بیتاب کہیں صد دل میں ہوں

میکش مرے دم سے باقی ہے دُنیا میں نشان معشوقوں کا
ہو جان کوئی افسانے کی افسانہ نگار دل میں ہوں

ہلالِ عید

چلنا سنبھل سنبھل کے ذرا اے ہلالِ عید
لغزش نہ دے کہیں ترے پا کو ہجومِ دید
مشتاق آج تیرا ہر اک خاص و عام ہے
دم لے ذرا سنبھل کہ بڑا اژدحام ہے
یہ آن صبر کش یہ ادائے حسین تر
یہ اعتدالِ نور یہ خم قاتلِ نظر
یہ حسن سرمدی کی تجلّی جھلک میں ہے
یا چشمِ نیم باز کی تابش پلک میں ہے
یا درز کھل گئی ہے کوئی آسمان کی
دُنیا کو جھانکتی ہے تپش اُس جہان کی
رنجِ عروسِ شبِ اوّل نہ دیدہ ہے
کیوں رنگ کس لیے ترے رُخ کا پریدہ ہے

ہاں تو نمود عاشق حیرت مآل ہے
یا ابروئے کشیدۂ اہل جمال ہے
مہ تمام کھول رہا ہے نقاب کو
یا برج قوس میں ہے گہن آفتاب کو
شاید تو کوئی طائر سدرہ مقام ہے
قائم ہوا میں بہر تماشائے شام ہے
☆ یا خنجر فگندۂ از دست قاتلے
یا ناخن بریدۂ از پائے شاہدے
☆ یا سجدۂ شکستۂ از فکر زاہدے
یا غمزۂ جہیدہ زا بروئے مہ رخے
☆ یا دست طالبے ست بدنبال مہوشے
یا مہوشے رمیدہ ز آغوش طالبے
ہے آج دیر سے تری گردن جھکی ہوئی
ہم بے خودوں سے شرم ہے یہ ایک ہی ہوئی
گو لاجواب شاعر میکش خطاب ہے
لیکن یہ خامشی تری سب کا جواب ہے

☆ یہ تینوں شعر علی رغم قافیہ دانان درج نظم ہیں۔ 12

علم انسان

وما اوتیتم من العلم الا قلیلا

علم انسان کی بنا مشاہدہ اور قیاس پر ہے یعنی کچھ چیزیں دیکھتا ہے اور کچھ چیزوں کو ان دیکھی ہوئی چیزوں کی مانند سمجھ لیتا ہے۔ قول شارح اور حجت کے طویل افسانے ان ہی دو جملوں پر ختم ہوتے ہیں۔

مشاہدہ تمام تر توہمات اور تقلید علمی سے مرکب ہے۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب اگر نہ کہا جائے تو کیا کیا جائے۔ اور قیاس خود مشاہدے کا تابع ہے۔

دلیل ایک فریب ہے جس کے ذریعہ انسان اپنے نفس کو تسکین دینا چاہتا ہے یا مخاطب کو اپنا فریب وقیع سمجھنے پر مجبور کرتا ہے۔ دلیل اس تکبر کا نتیجہ ہے جو جہل مرکب سے پیدا ہوتا ہے یعنی کسی شے کے سمجھنے کی فضول کوشش زعم علمی کے ماتحت میں۔

دلیل کوئی سبب نہیں ہے بلکہ علم سبب ہے یعنی جب کوئی شے یا واقعہ واقع ہو جاتا ہے تو اُس کو اپنے مشاہدات وقیاسات سے مطابق کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ انتہائے جہالت یہ ہے کہ اگر ہمارا علم اُس واقعے سے مطابق نہ ہو تو بجائے اپنے علم کی کوتاہی کے احساس کے اُس واقعے کی صحت سے انکار کیا جائے۔

حقیقت کلی ہے اور کلی کا وجود خارج میں نہیں ہے۔ حقیقت کی تلاش کا بہترین ذریعہ اپنی تلاش ہے دُنیا اُس وقت تک حقیقت سے دور رہے گی جب تک حقیقت کو اپنے باہر تلاش کرے گی۔ اگر ذرّے کی حقیقت معلوم ہو جائے تو تمام موجودات کی حقیقت معلوم ہو جائے۔

حقیقت واحد ہے اور وجود محض حقیقت ہے وجود محض میں اجتماع و ارتفاع نقیضین محال نہیں ہے بلکہ واقع اور ثابت ہے اور عقلائے زمانہ مظاہر حقیقت کی صفات سے علم حاصل کرتے ہیں اور مظاہر کی صفات آپس میں اضداد ہیں اس لیے ہمیشہ ان کو ایک علم اپنے پرانے علم و تجربے کے ضد اور مخالف حاصل ہوتا ہے وہ سمجھتے ہیں ہم ترقی کر رہے ہیں حالانکہ وہ ایک دائرہ میں گردش کر رہے ہیں ایک قید سے نکلتے ہیں اور دوسری قید میں مقید ہو جاتے ہیں یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا یہاں تک کہ موجودات کا سلسلہ ہی ختم ہو جائے یا ان لوگوں کو سکون حقیقی حاصل ہو اور وہ موت ہے یا عرفان تام جس کو موتوا قبل ان تموتو کہا گیا ہے اور واعبد ربک حتیٰ یاتیک الیقین جس کی طرف اشارہ ہے۔ مگر یہ لوگ سکون حقیقی سے آشنا نہیں ہو سکتے اس لیے کہ یہ علم اعراض حاصل کرتے ہیں حقیقت جو کہ ہستی صرف ہے اُن کے مبلغ سے بلند ہے۔ یہ علم صفات میں پابند ہیں اور ذات اشیا تک ان کی رسائی نہیں ہے حقیقت نامحدود ہے اور ان کا علم و عقل محدود اور محدود نامحدود کو حاصل نہیں کر سکتا۔

1927

کھو گیا میں ترے جلوے کا نظارا کر کے
چھپ گیا تو مری حیرت کو تماشا کر کے
معرکہ حسن و محبت کا سر انجام ہوا

ہم نشیں رہنے دے مجھ سے غم الفت کو نہ پوچھ
اس کو حادث نہ سمجھ اس کی قدامت کو نہ پوچھ
اس کا آغاز ہوا اور نہ انجام ہوا

کون سمجھا کہ مرے سوز نہاں تھا کب سے
شمع ساں جل بجھا اور آہ نہ نکلی لب سے
سن ترے چاہنے والے کا یہ انجام ہوا

آپ یوں بن کر نہ آئیں بام پر
ہو گیا دھوکا سحر کا شام پر
ہم سے کیا دیکھا جو پردہ کر لیا
حرف آیا عاشقوں کے نام پر
عہد کرکے آپ ہی جب پھر گئے
زور کیا ہے گردشِ ایام پر
شادی بے معنی ہے علت نہیں
مرمٹا ہوں پھر کسی گلفام پر
کس کو سمجھا ہوں تری پہلی نظر
مٹ رہا ہوں لذتِ آلام پر
مر گیا سن کر نویدِ وصلِ یار
رحمتِ حق میکشِ ناکام پر

یہ کیوں کہوں کہ نہیں آشنا زمانے میں
وہی ہے کیف ہے جس کو مرے ستانے میں
خدا کے نام پہ کرتے ہیں ہم بتوں سے وفا
نہ ہو جو قدرِ وفا کی نہیں زمانے میں
ہمارا سوز بھی ہے زیبِ ہر بیاں لیکن
تمہیں ہو جانِ فسانہ ہر اک فسانے میں
شکن جبیں پہ ہے اور زیرِ لب تبسم ہے
نظر میں رحم تردد ہے رحم کھانے میں

خلش تو تھی میں خلش سے مگر فزوں تڑپا
اُسے بھی آج مزا آگیا ستانے میں
ہے خانقاہ میں بے جا تلاش میکش کی
ملیں گے آپ کو حضرت شراب خانے میں

برباد آرزو کو دیوانہ کہہ دیا ہے
اک لفظ کہہ کے تم نے افسانہ کہہ دیا ہے
نازانِ آشنائی مشکل میں پڑ گئے ہیں
یعنی تری نظر نے بے گانہ کہہ دیا ہے
میں نازشِ جنوں سے دیوانہ ہوگیا ہوں
جب اُس نے تنگ آکر دیوانہ کہہ دیا ہے
آزادِ دو جہاں ہوں ہاں تم برا نہ مانو
میں نے تو ایک فقرہ رندانہ کہہ دیا ہے
رہزن نگاہ تیری یاں آنکھ میں مروّت
خاطر سے تیری دل کو نذرانہ کہہ دیا ہے
میکش ہے اور ترک جام و سبو کو آخر
نظروں نے تیری رازِ میخانہ کہہ دیا

پھر ذرا یادِ غم کا گلِ پیچاں ہوجائے
دل پریشاں ہے تو ہستی بھی پریشاں ہوجائے
ایک بار اور تماشا ہو تمھیں میری قسم
پھر تم آئینہ بنو آئینہ حیراں ہوجائے

یاد کرنا مری بربادی دل کا منظر
جب پراگندہ خزاں سے گل خنداں ہوجائے
برہمی سے غم کا کل کی پریشان ہیں آپ
دل کی کیا فکر ہے دل اور پریشاں ہوجائے
تم مسلماں ہو تو اسلام ہے ایمان مرا
تم ہو کافر تو مجھے کفر ہی ایماں ہوجائے
ہے تری ضد سے فقط لطف شکایت ورنہ
میں پشیماں ہوں جو ظالم تو پشیماں ہوجائے
عشق کی کوئی حقیقت جو سمجھ لے میکش
تیری مانند شہید غم ہجراں ہوجائے

عنصر یہ ہیں ہماری دیوانی زندگی کے
تخئیل فلسفے کی جذبات عاشقی کے
کیا مجھ کو گرمی عالم کا غم نہیں ہے
لیکن میں سن رہا ہوں کچھ عذر بیخودی کے
اے محو ساز شادی سن میرا سوز غم بھی
سمجھانا چاہتا ہوں معنی تجھے خوشی کے
مر کر جئیں گے اب ہم جینے کا یہ سبب ہے
سمجھے ہیں زندگی کو اسباب زندگی کے

اللہ اللہ ترے حسن کی شہرت یعنی
سوائی سے خالی نہیں محفل کوئی

بدگمانی ہے مجھے اور دلِ ناداں کو خوشی
مسکراتا نظر آیا سرِ محفل کوئی
آپ بلبل اسے کہہ لیجیے مری رائے یہ ہے
وقتِ نظارۂ گل چھوڑ گیا دل کوئی

تم نے دکھائی ہیں وہ چرا کر نگاہ کو
جو شوخیاں کہ چھوٹ گئی تھیں نگاہ سے
تعمیر کر رہا ہوں اُسی سے جہانِ دل
لایا تھا میں جو حشر تری جلوہ گاہ سے
ہے زندگی محال تغافل سے آپ کے
دل بچ کے کیا کرے نگہ بے پناہ سے

الٰہی الاماں دردِ محبت میں نے مانگا تھا
طلب کس روز مجھ کمبخت کو تھی دردِ ہجراں کی
ہوئی صحرا نوردی ختم کب کی اے جنوں لیکن
کھٹک کب تک رہےگی پاؤں میں خارِ مغیلاں کی
کوئی سمجھائے مجھ کو وقتِ رخصت کس لیے رویا
وہ ظالم تھی خوشی جس کو مرے حالِ پریشاں کی
تمھیں میں کیا سمجھتا ہوں تمھارا دل بتا دے گا
مجھے تم کیا سمجھتے ہو قسم تم کو مری جاں کی؟

52

سہتے سہتے غم محبت کے یہ حالت ہوگئی
ہنس کے بولا جو کوئی اس سے محبت ہوگئی

خوش رہو دُنیا میں تم ہم تو اسی میں شاد ہیں
تم سے مل کر رولئے ہلکی طبیعت ہوگئی

شکر کیجے یا شکایت اُس نگاہِ ناز کی
جو عنایت بن کے آئی اور قیامت ہوگئی

انتقامِ ناکامی

اب گھر چلی ہے رات فضائے بسیط پر
سرمہ برس رہا ہے کسی کی نگاہ سے
اُٹھا ہوں اب وہ لیکے سیاہی کیساتھ ساتھ
لایا تھا میں جو حشر تری جلوہ گاہ سے
کرتا ہوں اب سحر میں فنا ہو کے رات میں
ناراض ہوں میں تیرے لبِ عذر خواہ سے
سوؤں نہ سونے دونگا تجھے صبح حشر تک
پرہیز ہے تجھے مری بد خو نگاہ سے
اُس بات کا جواب ہے کل بزمِ غیر میں
مجھ سے کہی تھی تو نے جو نیچی نگاہ سے

سن او فریب خوردۂ یک کیفِ دلبری
کہتا ہوں میں تجھ سے محبت کی راہ سے

میں شاہدِ حقیقتِ حسنِ مجاز ہوں
چاہوں تو لاکھ حسن بنادوں نگاہ سے
واقف ہوں میں جہان کے کیفِ مزاج سے
چاہوں تو دوجہاں کو مٹادوں اک آہ سے
ہوجائے ایک دم میں فنائے تعینات
منہ پھیر لوں اگر میں تخیل کی راہ سے
حُسنِ خیال کی یہ مرے سب نمود ہے
تیرا وجود ہے مرے کیفِ نگاہ سے
عجز و نیازِ عشق فقط ایک شغل ہے
کچھ ربط ہو گیا ہے مجھے سوزِ آہ سے
میں ہوں شہیدِ شاہدِ بزمِ تجلیات
سن میرا مرثیہ شفقِ صبح گاہ سے
تجھ سے مرا معاملہ اس سے فزوں نہیں
اپنے کو دیکھتا ہوں میں تیری نگاہ سے

میرا مشرب

طریقہ ہے مرا نامہرباں کو مہرباں کہنا
جسے سب جاں ستاں کہتے ہوں اس کو جانِ جاں کہنا
خدا کہنا ہر اک کافر کو ہر قاتل کو سردینا
جو دشمن جان و دیں کا ہو اسے ایمان و جاں کہنا
اگر فرقت میں جاں نکلے سمجھنا یہ تمنا تھی
نہ نکلیں جو تمنائیں کہ دل سے اُن کو جاں کہنا
مری عادت ہے خوش رہنا ستمگر کے ستم سہکر
تبسم ہر دلِ غمگیں کا تم میرا نشاں کہنا
سوائے بیخودی معیوب ہے ہر وصف الفت میں
تحمل کو فغاں کہنا خموشی کو بیاں کہنا
مرا شیوہ ہے عزت عاجزی کی کبر کی ذلت
زمیں کہنا فلک کو اور زمیں کو آسماں کہنا
ہم اے میکش تری دیوانگی سے تنگ آئے ہیں
[illegible]

دُنیا دیوانی ہے

اُس نے کہا ''میکش'' کو محبت راس نہ آئی آخر دیوانہ ہوگیا۔ بات ختم ہوئی مگر میری فکر کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ آخر مجھے دیوانہ کیوں کہا؟ دیوانگی کسے کہتے ہیں؟ قویٰ اور افعال میں فنائے تناسب وترتیب جنون کے لیے سبب امتیاز ہو، مگر میرے خیال میں جس کے افعال وحرکات مغلوبِ جذبات ہوں وہ ''دیوانہ'' ہے اسی لیے تو اس نے مجھے دیوانہ کہا جذبات عالی ہوں یا ادنیٰ جا ہوں یا بے جا۔ مثلاً کسی شے سے متاثر ہوکر جذباتِ رقص پیدا ہوئے۔ ایک شخص ناچنے لگا جو سبب سمجھنے سے قاصر رہے۔ اُنھوں نے کہا دیوانہ ہے۔ دوسرا جذبات پر غالب آگیا وہ ہوشیار سمجھا گیا لیکن کیا ہوشیار ہر جذبے پر غالب آجاتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اور کیا دیوانہ ہر جذبے سے مغلوب ہوجاتا ہے؟ یہ بھی نہیں۔ تو پھر دیوانے کو دیوانہ کیوں کہتے ہیں؟ کیا اس لیے کہ اس کی مغلوبیت پر اکثریت کے اعتبار سے حکم لگایا جاتا ہے مگر اکثریت خود امر اعتباری ہے اور یہ بھی نہ ہو تو کسی شے کے تحقق ہونے کے لیے اُس کے جز کا متحقق ہونا کافی ہے۔ قوائے باطن تو سب کے مغلوب جذبات ہوتے ہی ہیں اس صورت میں افعال کا معتبر ہونا عبث ہے۔ لہٰذا ہر شخص دیوانہ ہے۔ کیا مجھے صرف اس لیے دیوانہ کہا جاتا ہے کہ میں ان کی پرستاری میں بدنام ہوں۔ لیکن بڑے بڑے ہوشیار اور متقی وزاہد جس نظر سے ان کو دیکھتے ہیں

اس کا درد میرے غیور دل سے زیادہ کون محسوس کر سکتا ہے کیا وہ دیوانے نہیں ہیں۔غور سے دیکھو تو ہر شخص ایک خیال کے تحت اثر کام کرتا ہے جس کی صحت و واقعیت کا اس کو یقین ہوتا ہے مگر ہر خیال ایک قید اور ایک تعین ہے اور حقیقت ہر قید و تعین سے آزاد ہے تو کیا ہر شخص دیوانہ نہیں ہے۔ایک مذہبی آدمی اپنے مذہب کی صداقت پر اس قدر یقین رکھتا ہے کہ دُنیا کے مذاہب اس کو باطل نظر آتے ہیں۔کیا یہ جنون نہیں ہے۔ایک فلسفی اپنے مخترعہ نظریہ کے خلاف دُنیا کی تحقیق کو لغو سمجھتا ہے۔ایک سرمایہ دار سرمایہ داری کو حاصل زندگی سمجھتے ہوئے لطائف حیات سے محروم ہے۔اسی طرح دنیا کا ہر فرد حقیقت کے خلاف جدوجہد میں مصروف ہے ہر شخص اپنی زمین کو زمین اور اپنے آسمان کو آسمان اپنی حرکت کو حرکت اپنے سکون کو سکون سمجھتا ہے کیا یہ جنون نہیں ہے۔ ہر شے اپنے غیر سے محض اعراض و اعتبارات سے ممتاز ہے اور اعراض و اعتبارات کا خود وجود نہیں ہے اور پھر دنیا ہے کہ ان اعتبارات پر مٹی جاتی ہے اس کے بعد کیا یہ کلیہ قائم نہیں ہوتا ہے کہ دُنیا دیوانی ہے۔

میں کہ حامل راز محبت ہوں وہ محبت جس سے موجودات کی تعبیر ہے جس سے نظامِ عالم کا قیام ہے جو اعلیٰ ترین اخلاق ہے جس سے انسان مخلوقات میں ممتاز ہے اور پھر وہ مجھے دیوانہ کہتے ہیں۔

خیر اگر میں دیوانہ ہوں تو معلوم ہونا چاہیے کہ ہوشیاری ایک بے معنی لفظ ہے۔مگر یہ خطاب عطیہ حسن ہے اس کو عام کرنا آدابِ محبت کے خلاف ہے یہ لفظ میرے لیے مخصوص ہے اور رہے گا۔

میں نازشِ جنوں سے دیوانہ ہوگیا ہوں
جب اس نے تنگ آکر دیوانہ کہہ دیا ہے

1926

کل اس طرح اُن سے تصادم رہا
وہ سنورا کیے اور میں گم رہا
مرے دل کی بھی عمر اُتنی ہی تھی
ترے لب پہ جتنا تبسم رہا
رہی بے سبب زلف برہم تری
مرے دل کو کیا کیا توہم رہا
رہا میں بھی محفل میں اُن کی طرح
نگاہوں میں لیکن تکلم رہا
مرے سوز کی کیفیت اُس میں تھی
لبوں پہ جو تیرے تبسم رہا
پلاکر ہی میکش رہا شیخ کو
بہت دیر جھگڑا سرِ خم رہا

میں حقیقت میں کبھی غیر پہ مائل نہ ہوا
نہ ملا اُس سے جو وجہ خلش دل نہ ہوا
عمر بھر تیری تمنائیں مرے دل میں رہیں
دل مگر تیری تمناؤں کے قابل نہ ہوا
تپش وسوزِ دروں سے نہ گئی علت دل
حسن برباد جو برباد کن دل نہ ہوا
ہوگئی درد پہ درماں طلبی ہی یعنی
تم سے ملنے سے بجز رنج کے حاصل نہ ہوا
نہ ہو شرمندہ جفا کرکے میں قرباں تیرے
یہ عنایت بھی بہت ہے کہ تو غافل نہ ہوا
راز دزدیدہ نگاہی کا تری کھل نہ سکا
آج کے دن تری قسمت سے مرا دل نہ ہوا
خود نمائی کو مری ذوقِ تماشا نہ ملا
میں ہوا غرق تو لیکن سر ساحل نہ ہوا
شمع کشتہ کا وہ منظر وہ وداع محفل
خیر یہ گذری کہ پروانہ محفل نہ ہوا
میری دیوانگی اللہ سلامت رکھے
تیرے گیسوئے پریشاں تو ہیں گر دل نہ ہوا
لوگ سمجھا کیے ہر رنگ میں شامل مجھ کو
ورنہ میکش میں کسی رنگ میں شامل نہ ہوا

کیسے کہہ دوں کہ کوئی زینت آغوش نہ تھا
اک ثبوت اس کا یہی ہے کہ مجھے ہوش نہ تھا

لذتِ درد نے دوری کو بنایا منزل
ورنہ اس کیف کے عالم میں وہ روپوش نہ تھا
جان دینا ہی تھا مقصودِ محبت میں مجھے
آپ سمجھے کہ محبت میں مجھے ہوش نہ تھا
تھا قیامت کا نہ ہونا بھی قیامت مجھ کو
دل ستم کوش تھا جس دم وہ ستم کوش نہ تھا
ہجوے وعظ میں اور برسرِ منبر افسوس
آج مسجد میں مگر میکش سے نوش نہ تھا

کوئی دن میں خود ہی نہ ہوں گے ہم ہمیں کیا ہے جو رہا کوئی یا نہ رہا
وہ گئے تو گئے یہ قلق ہی رہے نہ رہے بھی تو کوئی سدا نہ رہا

جب دل نہ رہا تو خوشی نہ رہی جو خوشی نہ رہی نہ رہا غم بھی
جب غم نہ رہا تو خلش نہ رہی جو خلش نہ رہی تو مزا نہ رہا

مدداے خلش سوزِ الفت مجھے تیرے ہی دم سے تسکین ہے
مرے ساتھ جنونِ محبت میں کوئی ایک بھی تیرے سوا نہ رہا

غیرِ شے غیر کو حاصل ہو یہ ہے ناممکن
طلبِ جلوہ نہ کر آپ ہی جلوا ہوجا

چند آہیں چند قطرے خون کے
تھا یہ دل کا کاروانِ مختصر

سن چکے ہو نام سے جو قیس کے
تھی وہ میری داستانِ مختصر
وسعت دل اور تمنائیں تری
یہ ہجوم اور آستانِ مختصر
عشق اور پابندی آدابِ ہوش
لاکھ جھگڑے ایک جانِ مختصر
سنتے سنتے میری فرمانے لگے
اس کو کہتے ہیں بیانِ مختصر

اک شورش ہے تسکین دروں ہے ایک سکونِ شورش زا
معلوم نہیں خلوت میں ہوں محسوس نہیں محفل میں ہوں

وہ میری برائی ہی کے سبب آتا تو ہے تم کو دھیان مرا
تم دل میں ہو میرے تو کیا ہو میں ہوں کہ تمھارے دل میں ہوں

تم دل ہو تمنا کا تم دل کی تمنا ہو
تم کیف ہو دُنیا کا تم کیف کی دُنیا ہو
میں جان سے جاتا ہوں تو دل میں سماتا ہو
ہستی مری مٹتی ہو نقشہ ترا جمتا ہو
ہے میرے جنوں میں بھی کچھ جذبِ نظر لیکن
جب تم ہو تماشائی پھر کیوں نہ تماشا ہو
للچائی ہوئی نظریں شرمائے ہوئے تیور
مر جاؤں نہ کیوں جب یوں مرنے کا تقاضا ہو

تم دل کی مسرت ہو تم نور ہو آنکھوں کا
تم زینتِ خلوت ہو تم انجمن آرا ہو
یاد آئے تو میکش کا کچھ ذکر بھی ہمدم ہو
ان مست نگاہوں سے جب کیف برستا ہو

مضطر ہے تیرے سامنے بھی یہ غضب تو دیکھ
او بدگمان ہاتھ تو رکھ دل پہ اب تو دیکھ
جب تیری دید کے لیے لاکھوں دعائیں تھیں
اب موت کی طلب ہے جنونِ طلب تو دیکھ
مانا کہ شانِ حسن ہیں بے التفاتیاں
تیری طرف نہ دیکھ رہا ہوں میں جب تو دیکھ
بیٹھے ہیں کس طرح سے ترے در کے سامنے
ان ساکنانِ دشتِ جنوں کا ادب تو دیکھ
دیوانہ زلف کا ہوں مرا حال اے طبیب
اب دیکھ اور چھانے لگے شام جب تو دیکھ
میکش نے جان دی ترے ہنسنے کی آن پر
کتنا حسیں ہے اس کی قضا کا سبب تو دیکھ

دمِ وداع وہ نیچی نظر معاذاللہ
ہے خوں بہائے تمنا مگر معاذاللہ
وہ سو کے اُٹھنے کا عالم تری ستم پہ ستم
وہ زلف چھائی ہوئی تا کمر معاذاللہ

اب بھی دزدیدہ نگاہِ ناز ہے
کیا مرے رونے میں بھی کچھ راز ہے
بن گئے افسانے میری آہ کے
خامشی تیری کہ اب بھی راز ہے
دیکھنے والے کی آنکھیں دیکھئے
آپ کو صورت پہ اپنی ناز ہے
ہو چکی ناکامیوں کی انتہا
اور اُلفت کا ابھی آغاز ہے
کیا کروں تیری جفاؤں کا خیال
میں سمجھتا ہوں جنونِ ناز ہے
میکش وانکارِ بادہ حف نظر
لاؤ ساغر یہ بھی اک انداز ہے

ہوش لازم ہے یہ مجمع عام ہے
بام ہے اے جلوہ افگن بام ہے
کیوں بیاں کرتا ہے لذاتِ سحر
دیکھ اے رہرو ابھی تو شام ہے
زیست میری اور یہ ایام فراق
اے اُمیدِ وصل تیرا کام ہے
ہم کو ناکامِ محبت کیوں کہو
مرگ ناکامی ہمارا کام ہے
اب تو آجاؤ کہ ہے صبح فراق
اب تو آجاؤ کہ میری شام ہے

شاہدوں میں بھی اشارے ہم پہ ہیں
عاشقوں میں بھی ہمارا نام ہے
پردے والوں سے تغافل کا گلہ
کیوں کروں جب لذتِ آلام ہے
حادثاتِ ہجر میں سر دے دیا
واقعاتِ دل کا سر انجام ہے
بسملوں کا دل مگر دیکھا نہیں
تیغ کو کہتے ہو خوں آشام ہے
عاشقی اور عقل کی پابندیاں
سچ یہ ہے میکش تمھارا کام ہے

دشمن کی تباہی کی خاطر سامان لیا ہے دشمن سے
یہ عشق کی بجلی پیدا کی ہے ہوش وخرد کے خرمن سے
تیری وہ نظر، پروردۂ دل، دُنیا جسے بجلی کہتی ہے
گرتی ہے میرے نشیمن پر بنتی ہے میرے نشیمن سے
صحرا کو نہ ہو نکہت کی طلب کیا میں نہیں وسعت صحرا میں
رنجش ہے چمن کے پھولوں سے شکوہ ہے نسیم گلشن سے
ہو جایا کرے کچھ ذکر کبھی ناکامِ محبت میکش کا
جب اُٹھتے ہو تم بستر سے یا لوٹتے ہو جب گلشن سے

اب دیکھنے لگے ہیں وہ مجھ کو مسکرا کر
شاید یقین میری الفت کا آچلا ہے

میں تم کو چاہتا ہوں میری غرض بھی سمجھے
میں موت مانگتا ہوں مرنا مری دوا ہے
اپنی زباں سے کرلو اقرار تم وفا کا
اتنی سی آرزو ہے اتنی سی التجا ہے
تو صبحِ موسمِ گل میں شامِ روزِ غربت
معلوم تجھ سے ملنا ہر چند مدّعا ہے
کرتے ہو قدر اب کچھ جب یاد کچھ کرو گے
مرجاؤں میں تو کیا ہو زندہ ہوں میں تو کیا ہے
کے روز رہ سکوں گا میں تیرے ساتھ آخر
اک روز ہے جدائی دُنیا کا قاعدا ہے
او مجھ پہ ہنسنے والے تو مجھ کو یاد رکھیو
میں ہوں ترا پجاری تو میرا دیوتا ہے

تم کو دیکھے جو سکندر تو بنے آئینہ
تم اگر دیکھو تو آئینہ سکندر ہوجائے
کامیابی ہے ترے عشق میں ناکامی بھی
جو تری راہ میں کھو جائے وہ رہبر ہو جائے
ہو غضب تیرا تو اک قطرہ سمندر نہ رہے
تیری رحمت ہو تو ہر قطرہ سمندر ہوجائے
تیرے وحشی کا مداوا نہیں ممکن لیکن
مہرباں کاش تری زلف معنبر ہوجائے

کرتے ہو بے وفائی اور یہ بھی جانتے ہو
دُنیا میں کوئی اس کا میرے سوا نہیں ہے
مانا کہ جانتے ہو چتاییاں ہماری
سودائے عشق لیکن تم نے کیا نہیں ہے
اتنا دماغ کیوں ہے میکشؔ سے اے حسینو
کیا یہ سمجھ لیا ہے اس کا خدا نہیں ہے

جب دل نہ آیا تھا

(ناتمام)

ازل سے گو حسینوں کی محبت میری فطرت تھی
مگر فطرت ابھی نا واقفِ سوزِ محبت تھی
دلِ معصوم کو میرے ہر اک کافر سے الفت تھی
نہ تھا تکلیف کا احساس کیا اچھی طبیعت تھی

مری شرکت موقر تھی ہر اک معصوم صحبت میں
مسلم میری بے لوثی حسینوں کی جماعت میں
مری عصمت کی قسمیں معتبر اہلِ محبت میں
مری پر سوز آہیں منتظر بابِ اجابت میں

سمجھتا تھا نہ کچھ معنی میں دزدیدہ نگاہوں سے
گماں کرتا نہ تھا کچھ بھی کسی کی سرد آہوں سے

نہ تھا واقف لگاوٹ کی میں ان پیچیدہ راہوں سے
نہ اُلجھا تھا کسی کافر کی مژگانی سیاہوں سے

نہ دیکھا تھا کسی کا ہنس کے زلفیں کھول کر آنا
نہ دیکھا تھا کسی کا آہ بھر کر جان سے جانا
نہ تھا معلوم کیا ہوتا ہے دل لے کر مکر جانا
نہ تھا معلوم ہو جاتا ہے کیسے کوئی دیوانا

نہ تھا معلوم دل جاتا ہے اک چشم عنایت میں
نہ تھا معلوم الفت کی سزا ملتی ہے فرقت میں
نہ تھا معلوم دل کو عیب لگ جاتا ہے الفت میں
نظر بدنام ہوجاتی ہے پاکیزہ محبت میں

خبر کیا تھی مجھے الفت میں مر جانا بھی ہوتا ہے
جو کرتے ہیں محبت اُن سے شرمانا بھی ہوتا ہے
خبر کیا تھی مجھے جینے میں غم کھانا بھی ہوتا ہے
ضروری آنے والے کے لیے جانا بھی ہوتا ہے

نہ سمجھا تھا کہ دل لے کر کوئی ناراض ہوتا ہے
نہ سمجھا تھا کہ دل دے کر کوئی کمبخت روتا ہے
کسی کے پاؤں پہ سر رکھ کے کوئی جان کھوتا ہے
کوئی ہم سے نہ بولے اب کوئی یہ کہہ کے سوتا ہے

71

ہوا کیا حال دل کا کیوں کسی انجان سے کہیے
توجہ ہو نہ دانا کی تو کیا نادان سے کہیے
نہ ہو جب داد کی حسرت تو کس ارمان سے کہیے
نہیں کیا آپ کو معلوم، ہاں ایمان سے کہیے

سہرا

(ناتمام)

تابش روئے منور سے منور سہرا
نکہت زلف معنبر سے معنبر سہرا
شان ترجیح کی معدوم ہے ان جلووں میں
سہرے سے رخ کی ضیا رخ سے منور سہرا
ہوگیا پاسِ ادب جوش مسرت میں فنا
ورنہ کیوں ہے تری دستار کے اوپر سہرا
اللہ اللہ عجب شوقِ قدمبوسی ہے
پاؤں تک آیا ہے نوشہ کے لٹک کر سہرا
بار درشاخِ محبت رہے دائم باہم
نیک ساعت میں بندھا ہو ترے سر پر سہرا
موجزن آج ہے دریائے مسرت میکش
اس لیے لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا

1925

جب اُس کو ڈھونڈتے تھے تو دل بھی نہ تھا کہیں
اب دل کیا تلاش تو وہ بھی وہیں ملا

کس سوز دل سے تم کو بنایا ہے اے بتو
تم سے نشانِ ذوقِ جہاں آفریں ملا

ہے محترز بھی ملنے سے میرے وہ یا عجب
خوش ہو کے مسکرا بھی دیا جب کہیں ملا

یارب شب فراق مرا دل کدھر گیا
اک قطرہ خوں سحر کو تہ آستیں ملا

آئے وہ میرے دل میں تو دل کو اُجاڑ کر
برباد جب مکان ہوا تب مکیں ملا

میکش سے تھی بہار تری بزم ناز میں
اب تو جہاں ملا ہمیں اندوہ گیں ملا

وجہ ناراضی تری اے مہرباں کھلتی نہیں
میرے بھی دل ہے مگر میری زباں کھلتی نہیں
سدِّ آزادی ہے قید شکلِ انسانی مجھے
مجھ پہ یہ پوشاک اب اے راز داں کھلتی نہیں
تو ٹھہرتا ہے تو ہو جاتی ہے دوبھر زندگی
تیری کیفیت بھی اے دردِ نہاں کھلتی نہیں
ہائے کس سے پوچھیے روداد قتل عاشقاں
اے تری وہ آنکھ جس کی داستاں کھلتی نہیں
منتظر ہوں میں کہ شاید کچھ مجھے تسکین دے
سن کے میرا حال چشم راز داں کھلتی نہیں
ایک دم بھاتی نہیں بے سوز بزمِ حسن گل
برق آ بیٹھے اگر بلبل نشیمن میں نہیں
مجھ کو غیرت ہے کہ کیوں ملزم ہے حسن بے زباں
برق میں کیا چیز ہے ایسی کہ خرمن میں نہیں
دل میں بے کیفی ہے یوسف کے جو دامن چاک ہے
دل میں وہ کچھ ہے زلیخا کے جو دامن میں نہیں
میرے دل کا حال تم خلوت میں چل کر پوچھنا
بزمِ دشمن کی شکایت بزم دشمن میں نہیں

آپ جو چاہیں کریں لیکن نہ دیجیے غیر کو
دل مرا دشمن ہو لیکن دل کا دشمن میں نہیں

شمع پروانہ ہے جس پر وہ ترا پروانہ ہوں
اے جمالِ یار تو روشن ہے روشن میں نہیں

بتادیں آپ اپنے دوستوں کے نام تو مجھ کو
سمجھ تو لوں کہ میرے کتنے دشمن ہیں زمانے میں
اگر زندہ رہوں گا تو مٹوں گا یادِ ماضی میں
نہ ڈھونڈوں گا کسی معشوق کو میں اب زمانے میں

زباں سے میری کیا نکلا تم ایسے سرگراں کیوں ہو
خموشی جب بیاں ہو شکوۂ طرزِ بیاں کیوں ہو
تمھارے حسن کا قصہ ہو یا میری محبت کا
جسے دل میں چھپائیں ہم وہ زیبِ داستاں کیوں ہو
تری آمادگی قاتل تبسم ہے محبت کا
توجہ گر نہیں مضمر تو قصدِ امتحاں کیوں ہو
اگر مٹنا مسلّم ہے تو تجھ پر کیوں نہ مٹ جائے
ترے ہوتے ہوئے آخر یہ دنیا رائیگاں کیوں ہو

اگر مسرور ہو دل سے تو کیوں بیزار ہو مجھ سے
اگر بے زار ہو مجھ سے تو دل میں مہماں کیوں ہو
یقیں کیا ہوگیا تم کو مرے دُنیا سے جانے کا
نہیں تو یہ بتادو آج اتنے مہرباں کیوں ہو

وہ ہستی جس کو کہیے عشق عکس حسن ذاتی ہے
نہیں جب درمیاں کشمکش تو اُس سے بدگماں کیوں ہو

ہاں ہاں مرا قصور تھا ایسے خفا نہ ہو
قربان اس ادا کے کوئی دیکھتا نہ ہو
لیلےٰ کے سوز دل کا نہ تم سے ہوا بیاں
وہ میرا راز کیف جو تم سے ادا نہ ہو
ثابت ہوا فضول ہے اظہار آرزو
کہیے تو کیا ہو اور نہ کہیے تو کیا نہ ہو
یارب مرے جنون محبت کی ابتدا
ایسے کے ہاتھ سے ہو کہ پھر انتہا نہ ہو

خمارِ دوشینہ

وہ دن پھر کبھی نہ آیا جب باہم نگاہوں میں دورِ محبت کی ابتدائی ہوئی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمھاری جھکی ہوئی نشیلی آنکھوں، عرق آلود رخساروں اور متبسم لبوں سے بجلی پھوٹ نکلے گی۔ ایسی شراب میں نے کبھی نہیں پی، اور شاید تم نے بھی۔ اُس روز کے سوا میں نے عشق کو کبھی نازاں نہیں دیکھا اور یقین تھا کہ اب حسن و عشق میں تصادم ہو جائے گا اور ہم تم منبسط ہو کر ذرّوں میں مل جائیں گے، فضا منور ہو جائیگی اور پھر کبھی رات نہ ہوگی۔

تم جب محبت آمیز معترف نظریں مجھ پر ٹھہراتے تو میں اپنے وجود کو تمام موجودات پر چھایا ہوا محسوس کرتا تھا اور کائنات کی ہر ہستی مجھے اپنے اندر شامل کرنے کے لیے بے چین نظر آتی تھی۔ مگر اب تو مجھے اپنی ہستی بھی مغائر معلوم ہوتی ہے۔

تجردِ امثال کا وہ عرض کس قدر رنگین تھا، مجردات کی وہ تجلّی کس قدر لطیف تھی، جو بجلی بن کر تم پر آئی اور مجھ پر گری۔ میں جانتا ہوں کہ میرا عشق تمھارے خال و خد سے بے نیاز ہے، اسی وجہ سے میرا مرض لا علاج ہے اور اسی دلیل سے میں پاکباز ہوں۔

عالم مجموعہ عناصر ہے اور عناصر کا ہیولیٰ واحد ہے، یہ نظریہ خواہ درست ہو مگر میں یقین نہیں کر سکتا کہ عاشق و معشوق وجود کے کسی درجے میں متحد ہو سکتے ہیں۔ میری ناامیدی

یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ تم مجھے دیوانہ کہتے تھے مگر اب میں بھی تم سے متفق ہوں اور اس لقب پر مجھے ناز ہے..... نہیں، بلکہ تھا۔ اب تو جذبات نے جمع ہو کر اشتیاق فنا کا قالب اختیار کر لیا ہے۔

خرافاتی سیکش

بادل میں

یہ ایک سلسلہ کوہ معلوم ہوتا ہے جو زمین سے اُٹھا ہے اور آسمان سے گزر گیا ہے درمیان سے نظر آنے والے آسمان کی برقی نیلگونی کس قدر نظر فریب ہے۔ شام ہوتی جاتی ہے اور منظر پر سرخی دوڑتی آتی ہے۔ شاید لالہ زار ہے۔ پرند ہوا میں کس سکون سے تیر رہے ہیں —— کاش میں بھی ان کے ساتھ ہوتا —— کچھ دیر غرقِ خیال رہنے کے بعد —— میں خود بھی اسی پہاڑ پر ہوں۔ کس قدر دلفریب منظر ہے۔ کاش وہ بھی ہوتے۔ اس وقت ان کو اپنے شورش آمیز نغمے ایسی پُر درد لے میں سناتا کہ اُن کا سکون میرے اضطراب سے بدل جاتا۔ میری دیوانگی کہ میں ہر مسرت کی تکمیل ان کی یاد سے کرتا ہوں۔ اور اُن کی بیگانہ وشی کہ گویا مجھ سے شناسائی بھی نہیں ہے۔ یا وہ ایسا ظاہر کرنے پر مجبور ہیں۔ اس قسم کے خیال مجھے برباد کیے دیتے ہیں۔ کسی نتیجے پر نہیں پہونچتا اور آخر جنون سا ہونے لگتا ہے۔ ان کا تبسم منفعل، نظر مکرر آ و سرد ایسے شواہد ہیں جو بدگمانی سے قطعاً مانع ہیں۔ سمجھ لیتا ہوں کہ اظہارِ محبت اور وفاداری سے مجبور ہیں۔ یہ ہے میری مسرت بے معنی کا راز جس پر دنیا ہنستی ہے۔ مجھے اُن کے تبسم میں اتنا درد و سوز محسوس ہوتا ہے جتنا اپنے رونے میں نہیں ہوتا۔ ان کی خاموشی سے اتنی غمخواریاں ٹپکتی ہیں جن کو کوئی ہمدرد ظاہر بھی نہیں کر سکتا۔ اُس وقت ان کی آنکھوں سے کتنی غم کی بجلیاں کوند جاتی ہیں جب وہ تبسم کو

مٹا کر آہ سرد بھر کر نظریں نیچی کر لیتے ہیں۔ ایک طرف یہ طوفانِ فریب اور دوسری طرف یہ طومار بدگمانی کہ مجھے اسی میں شک ہے کہ وہ میری محبت سے واقف بھی ہیں یا نہیں ـــــ

سلسلۂ خیال یہاں تک پہونچا تھا کہ بدن میں جمود پیدا ہوا اور بجلی کی سی چمک کے ساتھ وہ ہنستے ہوئے سامنے آ گئے۔ حیرت، خوشی، انفعال، کی ایک، مرکب کیفیت مجھ پر طاری ہوئی اور میں ان کے قدموں کی طرف جھکا اور گر گیا معلوم نہیں کتنی دیر بعد مجھے ہوش آیا۔ میری حیرت اور زیادہ ہو جاتی ہے جب خیال آتا ہے کہ مذکورہ منظر بادل کے مختلف ٹکڑوں میں تخیل نے بنایا تھا اور آہ وہ نہ تھے۔

بربادِ تخیل میکش

سیرِ دل

ایک دن جب کہ میں دماغی الجھنوں اور جمعیت شکن مناظر سے پریشان ہو گیا تھا جہانِ تخئیل کو لے کر اور بساطِ نظر کو سمیٹ کر خلوت کدۂ دماغ میں آ بیٹھا۔ طبیعت کو سکون ہوا وحشت کم ہوئی اور حواس جمع ہوئے۔ آنکھیں بند تھیں اور میں خواب کی تائید میں تھا مگر بجائے خواب کے ایسی غفلت طاری ہوئی جو اگر بیداری نہیں تو خواب بھی نہ تھی۔ میں ایک تاریک گہرائی میں ڈوبنے لگا۔ خدا معلوم کتنے روز بعد پاؤں تہ پر لگے اور صبح کاذب کی سی روشنی پیدا ہونے لگی۔ پہلی نظر زمین پر پڑی اور وہ ایسی سرخ تھی گویا ابھی یہاں میدان ہوا ہے اور خاک آلود خون میں ہلکی سیاہی آ چلی ہے۔ مہینوں اس زمین پر چکر لگاتا رہا۔ صرف اتنا معلوم ہوا کہ کسی جزیرے یا جزیرہ نما پر ہوں جو کبھی آباد تھیں ہوا ہے ایک روز جب میں اس کے قطبِ شمالی پر پہونچا۔ ایک نشیب میں میرا پاؤں پھسلا اور میں ایک لمبی گہرائی میں پھسلتا چلا گیا۔ دیر بعد ہوش آیا تو اپنے گرد ایک ہجوم دیکھا۔ وہ ایک ایسا مقام تھا جس کو نہ باغ کہا جا سکتا ہے نہ جنگل۔ ایک عورت نے جواباً کہا اس کا نام "عشق آباد" ہے اور شاید تمھاری زبان میں "دل" کہتے ہیں۔ اس نے کہا میرا نام "طلب" ہے۔ طلب ہمیشہ میرے ساتھ رہی۔ سب سے پہلے اس نے مجھے ایک بزرگ کی خدمت میں پیش کیا جن کا اسم گرامی "ضمیر" تھا مجھ سے عہد

لیا گیا کہ میں کبھی ان کی نافرمانی نہ کروں گا۔ ان کے ایک دیرینہ خادم ''حسنِ خلق'' نے مجھے پروانہ راہداری دیا جس پر لکھا ہوا تھا۔ ''برامت کہو برامت سمجھو، برامت مانو'' اس کے بعد میں نے تمام فضا میں ایک آزادانہ گشت لگایا بہت سے قصر دیکھے جن کے دروازوں پر ان کے مالکوں کے نام ''تواضع'' ''دیانت'' ''ریا'' ''تکبر'' وغیرہ لکھے ہوئے تھے، کہیں میں نے اندر بھی جانا چاہا لیکن طلب میرے ساتھ نہ تھی بلکہ ایک مہیب ہیئت انسان ''خوف'' آیا اور مجھے روک دیا۔ اسی طرح میں ایک باغ میں پہنچا۔ کوئی خوشنما پھول ایسا نہ تھا جو اس باغ میں نہ ہو۔ باغ کی مالک ایک جوان حسینہ ''تمنا'' نامی تھی۔ یہاں میں نے سب سے زیادہ قیام کیا۔ بہت سے پھول توڑے اور تعجب یہ ہے کہ مالکہ نے کبھی مجھے منع نہیں کیا اس باغ میں ایک درخت تھا ''ناکامی'' جس کے پتوں کی بو تمام باغ کے پھولوں کی خوشبو پر غالب رہتی تھی۔ میرے لیے یہ بہت پریشان کن بات تھی اس لیے میں نے ہمیشہ کے لیے اس باغ کو خیرباد کہہ دیا۔ دروازے سے نکلتے ہی ایسا لق ودق بیابان ملا جس کی ہیبت اب تک دل سے نہیں جاتی۔ اس بیابان کا مالک ایک کافر لقب رہزن تھا اس کا نام ''یاس'' تھا۔ بہ مشکل یہاں سے نکلا تھا کہ زبردستی ایک پیر خشک نہاد ''زہد'' ایک مسجد میں گھسیٹ لے گیے وہاں اور بہت سے متقین آدمی تھے لیکن اکثر باوجود ثقاہت زہد کے کنیزوں اور غلاموں سے فحش انداز میں مانوس دیکھے گئے۔ زہد کے شاگرد پیشہ بہت تھے۔ لیکن ریا، تکبر، طمع، بدگوئی ایسے تھے جن کی طرف لوگ زیادہ متوجہ تھے۔ مجھے یہاں بہت تکلیف ہوئی۔ زہد صاحب اگرچہ حور وقصور کے وعدوں سے میری پریشانی رفع کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے مگر میں تمنا کے باغ سے ایسا دل برداشتہ ہو کر نکلا تھا کہ کسی پر طبیعت ہی نہ آتی تھی۔ آخر ایک روز وہاں سے بھی بھاگ نکلا اس دوران میں بہت سی تکلیفیں اُٹھائیں اپنی جان سے عاجز تھا ایک روز تکالیف اپنی حد کو پہونچ چکی تھیں کہ ایک خوبصورت مغبچہ اُنس نہ معلوم کس طرف سے آیا اور میرا دامن پکڑ کر ایک بت خانے کی طرف لے چلا۔ دروازے پر ایک پیر مضطرب الحال عشق نے خوش آمدید کہہ کر ہاتھ پکڑ لیا اور دروازے کے اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ ''اس بتکدے کا نام سویدا'' تھا۔ دروازے پر لکھا ہوا تھا۔ ''اقرب الیہ من حبل الورید'' لیکن اندر داخل ہونے سے پہلے میرے ہوش وحواس

رخصت ہو چکے تھے۔ نہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے کچھ دیکھا اور نہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ کچھ نہیں دیکھا۔ اتنا یاد ہے کہ میں نے عشق سے ہزار مشکل جلوۂ مکرر کی خواہش کی۔ میں نے کہا مجھے ہر شرط منظور ہے۔ اس کے بعد میں ایک ناپیدا کنار سمندر میں ڈھکیل دیا گیا جس کا پریشانی حواس ایک قطرہ تھا۔ اس سمندر کا نام سوزِ عشق ہے! عشق نے کہا۔ عشق آباد کو یہی سمندر گھیرے ہوئے ہے۔ اب تم کچھ دن اس میں رہو۔ جب تک باہوش رہو گے اس میں رہو گے اور جب بیہوش ہو جاؤ گے ہمارے پاس اور ''خدائے دل'' کی خلوت میں باریاب ہو گے۔ اس دہشت سے میں چونک پڑا اب میں اپنی آرامگاہ میں تھا اس سے پہلے کہ میں یہ واقعہ کسی سے کہوں میں نے سنا کہ لوگ کہہ رہے تھے۔ ''افسوس میکش دیوانہ ہو گیا۔'' اس دن سے یہ حالت ہے جو تم دیکھتے ہو پہلو میں دل کی جگہ ایک سوز کا سمندر معلوم ہوتا ہے۔

شاید اب تم رازِ اُلفت سے کچھ آشنا ہو گئے ہو گے۔ تمھیں بھی عشق نے خدائے دل کی تجلیات میں سے ایک تجلی میرے باہوش رکھنے کی خاطر عنایت کی ہے۔ اب تو میری اور دل کی قدر کرو گے؟

1924

تمھیں کو شوق نہیں کچھ مجھے ستانے کا
نہیں ہے دل تو یہی رنگ ہے زمانے کا

تمھارے حسن کا شہرہ مرے فسانے سے
تمھارے حسن سے شہرہ مرے فسانے کا

غرض کہ اب کسی عنواں نہیں مجھے راحت
سکوں ہے نام مرے دل کے بیٹھ جانے کا

ہمیں تو کوئی حسینوں میں با وفا نہ ملا
تمھارا ذکر نہیں ذکر ہے زمانے کا

مجھے بھی اب تو تردد ہے عذر دحشت میں
نگاہِ مہر نے خوں کردیا بہانے کا

وہ لاش میکش ناکام نوجواں کی چلی
ستم ہے اُف یہ نتیجہ ہے دل لگانے کا

وحشتوں میں دل کی جمعیت کا ساماں ہوگیا
آدمیت سے ہوا خارج تو انساں ہوگیا
بھر گئیں آنکھوں میں تیری بزم کی رنگینیاں
میں نے دیکھا جس بیاباں کو گلستاں ہوگیا
اس ادا سے میں نے دیکھے داغ اپنے خون کے
اک تماشا روز محشر ان کا داماں ہوگیا
کرچکے بس تم علاجِ دردِ پنہاں کرچکے
ہوگیا تم سے علاجِ دردِ پنہاں ہوگیا
ہے خیال انجام کا اے تف بر انجام خیال
دیکھ کر محفل کو میرا جی پریشاں ہوگیا
کون ہے ایسا پجاری دیر میں اب اے بتو
کیا کرو گے تم اگر بیکل مسلماں ہوگیا

کیوں ہو نادم تم مری بربادیاں ہونے کے بعد
اور افسانہ کوئی یہ داستاں ہونے کے بعد
کھل رہی ہیں مجھ پہ وحشت کی ادائیں کس قدر
کیا بھلا لگتا ہے دامن دھجیاں ہونے کے بعد
آج سن لیتے مرا افسانۂ درد والم
پھر بھلا کس کی سنو گے تم جواں ہونے کے بعد
مٹ گیا آخر کو میں بے التفاتی سے تری
حسرتیں بڑھتی گئیں ناکامیاں ہونے کے بعد
دل میں پہلے ہی تمنا کی خلش کچھ کم نہ تھی
اور آفت ہوگئے تم مہرباں ہونے کے بعد

دل مٹا جاتا ہے آج اُن کا یہ عالم دیکھ کر
شرگیں ہیں غیر سے سرگوشیاں ہونے کے بعد
آتے آتے میرے گھر شاید وہ کافر رہ گیا
ہوگیا افسردہ میں بیتابیاں ہونے کے بعد
کوئی پوچھے تو خدا را آج انھیں کیا مل گیا
کس قدر خوش ہیں وہ مرے راز داں ہونے کے بعد
دل میں آنکھوں سے اُترنا ہی قیامت ہوگیا
آپ تو جاں ہوگئے دل میں نہاں ہونے کے بعد
کیا کہے گا کوئی سیکش اب یہ کھٹکا بھی گیا
ہوگئے آزاد ہم بدنامیاں ہونے کے بعد

اک تری نرگس مخمور کی مستی کے سوا
اور دنیا میں کوئی شے مری ہمراز نہیں
سن لیے کشف و کرامات کے قصے واعظ
دلربائی سے زیادہ کوئی اعجاز نہیں
آپ اترائیں نہیں آپ کو معلوم نہیں
بیخودی میں جو کہا ہے وہ مرا راز نہیں
ایک تم ہو کہ جفاؤں پہ بھی اتراتے ہو
ایک ہم ہیں کہ وفاؤں پہ ہمیں ناز نہیں
ہوگئی مست فضا روح ہوا میں دوڑی
موج ہے قلزم مے کی تری آواز نہیں
نہ دیا جواب نہ کچھ کہا نہ نظر اُٹھائی نہ رُخ کیا
مرا حال آپ نے سن لیا مگر ایسے جیسے سنا نہیں

وہ زلفِ معنبر سے بساتے ہیں صبا کو
مژدہ ہوا سیر خمِ گیسوئے دوتا کو
ناموں میں نہ الجھیں گے ترے دیکھنے والے
ہم ایک سمجھتے ہیں فنا اور بقا کو
گاڑو نہ زمیں میں کہ یہ زینت ہے جہاں کی
رہنے دو یونہی کشتۂ اندازِ جفا کو
ہم آپ کو دیکھیں گے جو اللہ نے چاہا
سب دیکھ رہے ہوں گے قیامت میں خدا کو
نغموں سے ہے اُن کے مرے نالوں کا تصادم
اے اہلِ نظر آج تواجد ہے ہوا کو
وحشت مجھے سجدے میں ٹھہرنے نہیں دیتی
کس طرح اُٹھا لوں ترے نقشِ کفِ پا کو
ہوتی ہے ابھی فاتحہ میکشِ آزاد
چھونا نہ کوئی جامِ مئے ہوش رُبا کو

آتے ہیں مضطرب مرا نامہ لیے ہوئے
ہے ہر نظر جوابِ تمنا لیے ہوئے
وہ چپ ہیں اور لبوں پہ تبسم ہے رقص کن
انداز میں خموشیِ گویا لیے ہوئے
بیٹھا ہوا ہوں غرقِ خیالِ حبیب میں
موجِ نفس میں کیف کا دریا لیے ہوئے
جاگ اے جنوں کہ قافلہ اُترا ہے مصر میں
تعبیر خواب ہائے زلیخا لیے ہوئے

بیٹھے ہیں مجھ سے سننے کو مجنوں کی داستاں
چہرے پہ شانِ عصمتِ لیلیٰ لیے ہوئے
میں مضطرب ہوں اور مرے جذبات وجد میں
وہ چپ ہیں اور کیف کی دُنیا لیے ہوئے
آخر کو زخم گن نہ سکے نامراد کے
دیکھا کیے وہ میرا کلیجا لیے ہوئے
اک دور ہی میں صبحِ قیامت ہوئی طلوع
بیٹھا ہی تھا میں ساغر و مینا لیے ہوئے
اتنا تو ہوش ہے مجھے احوالِ قبر کا
آیا تھا کوئی آپ کا نقشا لیے ہوئے
دیکھو ادھر بھی ایک نظر تم کہ میں بھی ہوں
نظروں میں داستانِ تمنا لیے ہوئے
ہیں منفعل سے آج وہ میکش کی یاد میں
ہر آنکھ میں خمار کی دُنیا لیے ہوئے

تم اُٹھ گئے اور یہ مرے پہلو سے نہ سرکی
جاں لے کے رہی دل میں خلش تیر نظر کی
کہتے ہیں کہ اب شکوہ کنِ درد نہیں ہے
یہ ہے تو مریضِ غمِ فرقت نے سحر کی
مٹتی رہی شب جلوۂ مدہوش، پر اُس کے
یوں رات مرے گیسوؤں والے نے سحر کی
سینے سے نمایاں ہی رہی قلب کی صورت
اُبھری ہی رہی چوٹ تری ترچھی نظر کی

بے دیکھے حسینوں کے میں رہ ہی نہیں سکتا
معذور ہوں میں مجھ کو شکایت ہے نظر کی
ہے وقتِ دُعا میکش بیمار کے حق میں
اب پوچھتے بیٹھے ہو خلش دردِ جگر کی

مدعی خود ہے خونِ بسمل کی
اُف وہ نیچی نگاہ قاتل کی
تم نے کیوں ناز سے مجھے دیکھا
اب مجھی پر نظر ہے محفل کی
اب نہ پھیرو نگاہ دم بھر اور
چٹکیاں پھر چکی ہیں بسمل کی
بیخودی پوچھ دل کی دھڑکن سے
کس جگہ ہے نگاہ قاتل کی
میرے رونے پہ رودیے وہ بھی
بدگمانی نکل گئی دل کی
اے زہے دل کہ ان کی خلوت میں
یاد ہوتی رہی مرے دل کی
تجھ سے ملنے سے اے سراپا ناز
وحشتیں اور بڑھ گئیں دل کی
خاک چھوٹے گا عشق اب میکش
ابتدا ہی بگڑ گئی دل کی

آپ کا عشق وجہ ہستی ہے
میری فطرت میں بت پرستی ہے
لگ گئی آگ جیب و داماں میں
اب جنوں کو فراغ دستی ہے
تیری آنکھوں میں ہے جو بیماری
وہ مری شکل پر برستی ہے
میں ہوں شاکر تری جفاؤں پر
یہ بھی اک شانِ فاقہ مستی ہے
آرزوئے وصال روزِ فراق
کس قدر مجھ پہ فقرے کستی ہے
آج میکش کے خوب گہرے ہیں
اُن کی نظروں سے مے برستی ہے

مٹ گیا دل ہم تماشائے فنا دیکھا کیے
کر ہی کیا سکتے تھے جو کچھ بھی ہوا دیکھا کیے
تم نہ آئے اور تدبیر جنوں ضائع ہوئی
ہم تصور میں تمھیں آتا ہوا دیکھا کیے
جذبہ دل کی مگر تاثیر الٹی ہوگئی
ہم تمھارا اور تم منہ غیر کا دیکھا کیے
بعض دن ایسا ہی ہوجاتا ہے میرا حال کچھ
جانے کیا کرتا رہا میں آپ کیا دیکھا کیے
ایسی کیا میری تمنائیں تعجب خیز تھیں
میں بیاں کرتا رہا تم منہ مرا دیکھا کیے

میں نے پوچھا غیر کے گھر آپ کیا کرتے رہے
ہنس کے فرمایا تمہارا راستہ دیکھا کیے
تیری اس وحشت کی اے میکش دوا بھی ہے کہیں
اک نہ اک پر نقش تجھے مردِ خدا دیکھا کیے

کس طرح مان لو ناصح اُسے بے مہر کہ وہ
نہ ہنستا ہو مرے رونے پہ نہیں یاد مجھے
مٹ گئی رسمِ وفا ختم ہوئی مشقِ جفا
ہوچکی آپ کی ضد کرچکے برباد مجھے
اب تو اس دردِ جدائی کو خدا ہی سمجھے
نہ وفا یاد ہے تیری نہ جفا یاد مجھے
جب شب عیش میسر ہو تجھے اے ظالم
میری حسرت کی قسم جو نہ کرے یاد مجھے
گرمی بزم کی اے دوست نہ رکھ مجھ سے اُمید
اب نہ وہ دل ہے نہ وہ دلکشیاں یاد مجھے
میں تو سوزِ غم فرقت میں جلا چاہتا ہوں
وصل کی کی ہو تمنا تو نہیں یاد مجھے

دوا پہ کیا ہے مجھے زہر ہی دوا ہو جائے
علاج کیا ہے اگر درد مدعا ہوجائے
دبائے حشر شب غم کو جب میں بیٹھا ہوں
خدا کرے کہ وہ آجائیں سامنا ہوجائے

کروں میں نذر تغافل کے دل یہ مشکل ہے
جو تم معاملہ کر لو معاملہ ہوجائے
قبول کر، کہ دُعاؤں کا خاتمہ ہے یہ
الٰہی دردِ محبت میں خاتما ہوجائے

چلے جاؤ اُٹھالوں گا مصیبت روزِ فرقت کی
ہوئی تقصیر یہ مجھ سے جو میں نے تم سے الفت کی
سلامت باش اے لیلائے دل اے سوزِ بے حاصل
تجھی سے یاد تازہ ہے ہمارے عہدِ وحشت کی
ترا چلنا ترا آنا ترا ہنسنا تری باتیں
مٹا کر مجھ کو چھوڑیں گی یہ تصویریں قیامت کی

منم امشب ثنا خوانِ محمدؐ
صلوۃ اللہ بر جانِ محمدؐ
بگو ہمدم کہ باز آمد شبِ غم
حدیثِ زلفِ پیچانِ محمدؐ
صلوٰتم باد بر خوبانِ مہوش
نہالانِ گلستانِ محمدؐ
بدہ ساقی شرابِ سوزِ اُلفت
بحق کیفِ چشمانِ محمدؐ

صفت چوں نیست غیر ذات اے دل
خدا خود ہست قرآن محمدؐ
صبا زیں بیکس بیمار فرقت
دعائے گو بہ ستان محمدؐ

صحرائے غم میں

اسیر فرقت کی پہلی شام

پانی ابھی تھما ہے بادل ابھی کھلا ہے
ہے شام اور سورج ڈوبا ہی چاہتا ہے
مشرق سے اب سیاہی اُٹھا ہی چاہتی ہے
محمل سے اپنے لیلیٰ نکلا ہی. چاہتی ہے
خورشید ایک قطرہ ہے مائل چکیدن
پر سوز و یاس آگیں چپ چاپ جاں سپردن
گویا کہ سر سے پا تک حالت ہے میرے دل کی
نقشہ ہے میرے دل کا صورت ہے میرے دل کی
پانی میں ہے روانی دلدل میں خامشی ہے
سبزے میں ہے روانی جنگل میں خامشی ہے
طائر سکوت میں ہیں چوپائے چپ کھڑے ہیں
کیا میری وحشتوں کے سب پر اثر پڑے ہیں

بیٹھا ہوا ہوں میں بھی اک پیڑ کے سہارے
غرقِ غمِ جدائی اک جھیل کے کنارے
شوخی میں ہیں ہوائیں لہریں مچل رہی ہیں
میں ہوں کہ میرے دل میں آہیں اُبل رہی ہیں
اب کے اگر لگے گا کوئی ہوا کا جھونکا
گھٹ جائے گا مرا دم صدمہ نہ ضبط ہوگا
اُلفت میں جب سے ان کی میں مبتلا ہوا ہوں
یہ پہلی مرتبہ آج اُن سے جدا ہوا ہوں

وہ رخصتی نگاہیں وہ شانِ اعتنائی
مایوسیوں کو دل کی وہ حکم اشنائی
رک رک کر اُن کا چلنا اور چل کے ٹھہر جانا
پی پی کے آنسوؤں کو وہ اُن کا مسکرانا
نظروں میں میری اب بھی وہ ہی سماں بندھا ہے
آنکھوں میں پھر رہا ہے بے چین کر رہا ہے
اب بھی اسی ادا سے وہ مل کے جا رہے ہیں
پھر پھر کے دیکھتے ہیں اور مسکرا رہے ہیں

میکش ہے تم پہ شیدا کہنے سے کام کیا ہے
تم نے سمجھ لیا ہے میں نے سمجھ لیا ہے
میں پاک باز اُلفت دیوانہ فنا ہوں
فنا ہی چاہتا تھا فنا ہی چاہتا ہوں

احوال سوز غم کا تم سے کبھی کہا ہے
اپنا ہی خوں پیا ہے اپنا ہی خوں کیا ہے
غیروں میں محو ہو تم مجھ پر نظر نہیں ہے
کیا چیز ہوں میں تم کو اپنی خبر نہیں ہے

پھر بھی ہے یہ تمنا پھر بھی یہ آرزو ہے
پھر بھی یہ مدعا ہے پھر بھی یہ جستجو ہے
آجاؤ اک گھڑی کو آجاؤ ایک دم کو
لیجاؤ میری جاں کو گل کردہ شمع غم کو
چشم کرم سے دیکھو زانو پہ سر کو رکھو
رہ جاؤں سرد ہو کر ایسی نظر سے دیکھو
کیوں طول دے رہے ہو افسانہائے غم کو
یہ قصہ مختصر ہو آجاؤ ایک دم کو

ارتقائے اُلفت

(ناتمام)

ہر چیز میں خلش ہے ہر حال کیف زا ہے
ہر صورت اک قیامت ہر منظر اک بلا ہے
غم دل میں جاگزیں ہے دل غم میں مبتلا ہے
جاں تنگ دردِ دل سے دل نا فراز دوا ہے
عرصے سے حال یہ ہے ہے درد سا جگر میں
مدت سے سہہ رہا ہوں مدّت سے ہو رہا ہے
سوزش ہے میرے دل میں سوزش میں ہے تسلسل
جادو کیا گیا ہے یا زخم ہو گیا ہے
یا مادہ جنوں کا ہے طالب شہادت
قاتل نہیں ملا ہے قاتل کو ڈھونڈتا ہے

اک اک ادائے دلنشیں دوشیزگی میں گم ہے
ہے چال اسکی جیسے ساغر چھلک رہا ہے
آنکھوں میں نازشیں ہیں بے چین ہیں نگاہیں
جس طرح کوئی اپنے عاشق کو دیکھتا ہے
تیور چڑھے ہوئے ہیں نظریں جھکی ہوئی ہیں
زلفیں کھلی ہوئی ہیں آنچل ڈھلا ہوا ہے
پوشاک ارغوانی اور اس پہ کامدانی
یا اوس سے مزین تختہ گلاب کا ہے
رنگینیاں مناظروں اُس سے لے رہے ہیں
گویا کہ دیکھتا وہ شامِ بہار کا ہے
کس درجہ ہے تصنع اور پھر بھی سادگی ہے
کس درجہ ہے تغافل اور پھر بھی دلربا ہے

میں دل پہ ہاتھ رکھے دیکھا کیا ہوں اکثر
وہ یہاں سے جارہا ہے وہاں سے گزر رہا ہے
بس اتنی کامیابی عرصے تلک رہی ہے
رستے میں مل گیا ہے محفل میں مل لیا ہے
مدت تک اُس سے اتنی رسمِ سخن رہی ہے
میں مسکرا دیا ہوں وہ مسکرادیا ہے
پہلی نظر میں اُس کو گو دل میں دے چکا ہوں
منہ سے نہیں کہا ہے ظاہر نہیں کیا ہے
نظروں پہ آج اُس کی، شوخی برس رہی ہے
احوال میرے دل کا شاید سمجھ گیا ہے

سب کی نظر بچا کر میں اس کو دیکھتا ہوں
میری نظر بچا کر وہ مجھ کو دیکھتا ہے
میں چپکے چپکے دل سے کچھ راز کہہ رہا ہوں
وہ میرے منہ پہ اُس کے آثار پا رہا ہے

جتنا نیاز مجھ کو اتنا ہی ناز اس کو
جتنا میں مٹ رہا ہوں اُتنا وہ بن رہا ہے
سجدے میں کر رہا ہوں وہ ہے تجلیوں میں
میں مضطرب ہوں اور وہ مسرور ہو رہا ہے
میں آہ کر رہا ہوں یا ساز چھڑ گئے ہیں
وہ مسکرا رہا ہے یا پھول کھل رہا ہے

ہے فصل مے پرستی طاری ہے کیفِ مستی
پانی برس رہا ہے بادل گھرا ہوا ہے
نظریں جھکی ہوئی ہیں جذبات جوش میں ہیں
میں مسکرا رہا ہوں وہ مسکرا رہا ہے
اظہارِ سوزِ دل پہ شرما کے ان کا کہنا
پھر ہم نہیں ملیں گے ظاہر اگر کیا ہے
جس وقت ہنس دیا ہے اک عید ہوگئی ہے
اک حشر ہوگیا ہے جب رُخ بدل لیا ہے
وہ میرا عرض کرنا میں جان بیچتا ہوں
وہ اُن کا ہنس کے کہنا دیوانہ ہوگیا ہے

اب تو نظامِ ہستی آمادۂ فنا ہے
جاں زار ہوگئی ہے دل خون ہوگیا ہے
دیوانہ ہوگیا ہوں دیوانہ ہوگیا ہے
میں دل کو ڈھونڈتا ہوں دل اُن کو ڈھونڈتا ہے
ناکام آرزو ہوں بدنام آرزو ہوں
ناکام رہ گیا ہوں بدنام کردیا ہے
نامہ نہیں کسی کا اے مہربان میکش
روداد ہے جنوں کی سن لیجیے اور کیا ہے

1923

تقریرِ دل کہ رازِ دروں برملا ہوا
کیا کچھ نہ تھا نظر میں تمھاری چھپا ہوا

ہیں مستفیض یار وہ چمن میری وحشتیں
وہ خار چن لیا جو نظر آشنا ہوا

پردے میں یہ کشش تری اے حسنِ مضطرب
میں بے خبر تھا اور یہ دل چلا ہوا

رودادِ کامیابیِ دل مختصر یہ ہے
جو ہوگیا فنا وہ مرا مدعا ہوا

سب ہم سفر گذر گئے عشقِ مجاز سے
میں بدنصیب رہ گیا منہ دیکھتا ہوا

سب دل دیے میں کیا کہوں میں بھی نہ رہ سکا
کچھ کہہ رہا تھا رنگ تمھارا اُڑا ہوا

پہلے ہی کم نہ تھا مجھے اے دل جنونِ شوق
پردہ اُٹھا تو اور ستم برملا ہوا
بیتابیوں کو ان کی یہ پردہ غضب ہے ہائے
مجھ سے تو عشق میں ستم ان پر سوا ہوا
میکش فنا ہی چارۂ سودائے عشق ہے
لو آج آ کے مل بھی گئے وہ تو کیا ہوا

دل اس ہجومِ جلوۂ جاناں میں رہ گیا
کچھ یاد ہے کہ زلف پریشاں میں رہ گیا
جتنا اگر تصورِ جاناں تو دیکھئے
لیکن خیالِ زلفِ پریشاں میں رہ گیا

اُٹھا شعلہ تری نظروں سے پہونچا مسکنِ جاں تک
کیا برباد جسم و جاں سے لیکر دین و ایماں تک
میں اُس برقِ تجلی میں ہوا ہوں گم جو جاری ہے
ترے رخسارِ تاباں سے تری زلفِ پریشاں تک
عبث اے بدگمانِ عشق تو نے اپنی جان دیدی
کہ تھا اُن کو بھی کا ذوق تیری چشمِ گریاں تک
یہی ہے وہ قیامت جس کا اتنا شور سنتے تھے
بہت دیکھا ہے اس کو شامِ غم سے صبحِ ہجراں تک

نامِ خدا حضور تو ہیں جانِ شاعری
اور میرا سوز و ساز ہے ایمانِ شاعری

کیا قدر کی ہے تم نے پریشان زلف کی
اس کو دیا خطاب پریشان شاعری
پاداش بدرد یار کے رخ کی تجلیاں
چشم رقیب دار وہ بستان شاعری
مژگاں کو دیکھیے تو اُٹھا لاؤں آئینہ
کہتے ہیں ان کو خار بیابان شاعری
اُلجھی ہوئی ہے طبع مضامین زلف سے
سلجھا رہا ہوں زلفِ پریشان شاعری
چشم رقیب اور ترا رخ ہزار حیف
کافر کی آنکھ اور یہ قرآن شاعری
سو کر اُٹھے ہیں دھیان کہیں ہے نظر کہیں
کتنی بہار پر ہے گلستان شاعری
میکش کو ہے تلاشِ مضامین بیخودی
ہاں پھر وہی نگاہ ہو ایمان شاعری

1922

اس دن کہ خود نمائی کا ان کو خیال تھا
بسمل وہ خود بھی ہوگئے میرا یہ حال تھا
کم ہمتی سے اپنی میں جیتا رہا مگر
جب انتہا ہوئی شب غم کی وصال تھا

مجھ سے ملے تھے وہ کبھی ہے یہ مجھے خیال سا
رونق بزم بیخودی تھا تو سہی وصال سا
ان کے شباب وناز سے اور مرے ضبط راز سے
آنکھوں میں ہے غبار سا سینے میں ہے اُبال سا
ان کی نگاہِ مست کی آج میں نذر ہوگیا
اُڑنے لگا غبار سا مٹنے لگا خیال سا
حُسن کو جس پہ ناز ہے عشق کا سوز وساز ہے
دل میں ہمارے داغ سا رُخ پہ تمھارے خال سا

دیکھا تو ہے بہت اُسے آج یہ کیا ہوا مجھے
پہلو میں اک کھٹک ہوئی جم گیا اک خیال سا
پوچھیں تو آپ جھانک کر آیا ہے کون کس کے گھر
بیٹھتا اُلٹا شکل گرد آپ کا پائمال سا
کیا ہوا کیسے بیٹھے ہو میکش خستہ کے بغیر
چہرے پہ ہے ملال سا آنکھوں میں اشتعال سا

اُنھیں پردہ کہ یہ وحشی مجھے رسوا نہ کریں
اور دیوانوں کو وحشت کہ وہ پردا نہ کریں
حسرتیں ہونٹوں پہ آمادۂ گستاخی ہیں
کیسے ہم آپ کو ہوشیار کریں یا نہ کریں
مجھے جلوے کی طلب عشق کو تسکیں سے گریز
وہ کریں رحم مرے حال پہ اب یا نہ کریں
کہہ دو موسیٰ سے کہ سن جائیں بتوں کی پہلے
نہ کیا ہو تو ابھی طور کا سودا نہ کریں
نازہ عشق کا کرتا ہے طلب صورتِ حسن
وہ کریں ہم کو فنا ہم اُنھیں دیوانہ کریں
منتوں سے مری مجبور جو وہ ہوجائیں
یوں کریں وصل کا اقرار کہ گویا نہ کریں

پھر سنبھالے بھی نہ سنبھلیں گے جنابِ میکش
چشم میگوں سے حضور ان کا مداوا نہ کریں

یہ سچ کہتے ہو تم الفت میں مٹ جانا بھی ہوتا ہے
مگر آ جاؤ تم تھامے جگر ایسا بھی ہوتا ہے

ہمارا عشق اک صورت ہے اُن کے حسن کامل کی
وہ ہوتے ہیں تو اُن کا دیکھنے والا بھی ہوتا ہے

مری امید کا نقشہ مٹا کر خوش نہ ہو ظالم
کہ جم جائے تو ایسا پاس کا خاکہ بھی ہوتا ہے

سوالِ وصل پہ میرے ادائیں اُن کی کہتی ہیں
قیامت ہے غضب ہائے کہیں ایسا بھی ہوتا ہے

1921

شرمندۂ نگاہِ کرم ہو کے رہ گیا
شکوہ زباں پہ شکرِ ستم ہو کے رہ گیا

ہے ہے وہ شوق آپ کے مشتاقِ دید کا
جو دل میں ٹیس آنکھ میں نم ہو کے رہ گیا

انجام اپنے سوز کا اے بے خبر نہ پوچھ
اک تیر تھا کہ سینے میں دم ہو کے رہ گیا

حسرت پہ کیوں نہ روئیے مقتولِ عشق کی
دو چار روز آپ کو غم ہو کے رہ گیا

تم کو تو ایک یہ کہ نہ آئے مگر یہاں
شوقِ وصال ہجر کا غم ہو کے رہ گیا

تم نے کیا نہ قتل مجھے ایک روز بھی
یہ شوق دل میں تیغِ ستم ہو کے رہ گیا

میکش یہ ناتمامی تاثیر غم تو دیکھ
یعنی کسی کو شوقِ ستم ہو کے رہ گیا

نا مت قرب ہوا وجہ حجاب
کاش کچھ دور وہ ہم سے ہوتا
الاماں تیرے غضب کے شعلے
کیا مرے دیدۂ نم سے ہوتا
چھوڑتے تب بھی نہ خوبانِ جہاں
دل اگر صید حرم سے ہوتا

یہ کیا کہ حلق پہ خنجر چلا کے ہنس دینا
یہ کیا کہ خاک میں ہم کو ملا کے ہنس دینا
نہ چھیڑیے مجھے بیٹھا ہوں جان سے بیزار
کوئی ثواب ہے مجھ کو رلا کے ہنس دینا
نگاہِ شوق پہ خنجر دکھا کے چھپتے ہو
چلو ہٹو نہیں اچھا جلا کے ہنس دینا
وہ ہاتھ جوڑ کے آنکھوں سے التجا میری
وہ ان کا ناز سے نظریں چرا کے ہنس دینا
سنبھالنا مجھے میکش کہ یاد آتا ہے
کسی کا دیکھنا اور مسکرا کے ہنس دینا

کھولے تھے اس نے بال کہ محشر بدوش تھا
میں بھی نہ جی سکا کہ قضا کو بھی جوش تھا

افسردگی کا دل کی شبِ غم یہ جوش تھا
جو نالہ میرے لب تک آیا خموش تھا
کیا گزری حسن و عشق میں آخر کہ صبح دم
تھی شمع کو خبر نہ پتنگوں کو ہوش تھا
محرومی نصیب تھی جب بھی یہی مگر
وہ تھے تو مجھ کو زہرِ غمِ عشق نوش تھا

کیسا گناہ کیسی دعا کس کا خیال کون مُت
عشق ہے میرے دل کا نام حُسن مری نگاہ کا
فلسفیان کم نظر حدِ نظر کہیں مگر
نام ہے آسماں تری سرمہ بھری نگاہ کا

سب دیکھتے ہیں اُٹھو تم بھی لب بام آؤ
کچھ پردے کی کہتا ہے دیوانہ سے چھپ جانا
گھریں وہ چھپائیں وہ ہم خوب سمجھتے ہیں
یاں دردِ جگر اُٹھنا واں رنگ کا اُڑ جانا
مانا کہ میں وحشی ہوں ہاں کیوں نہ کوئی سمجھے
بے وجہ مرا ہنسنا اور آپ کا شرمانا
گھبراؤ نہ تم صاحب شرماؤ نہ تم صاحب
بیماری ہے میکش کو گر پڑنا غش آجانا

قیام کن بہ تغافل کہ خو گرِ ستمم
تغافلت ز ادائے ستمگری دانم

بخاکِ من نشوی ملتفت تو اے گلِ تر
کہ قدرِ قطرۂ نم مہرِ خاوری داند

آیا تری آنکھوں سے ستمگر ابھی کچھ اور
بیٹھا مرے پہلو میں تڑپ کر ابھی کچھ اور
کب تک یہ ستم ہم پہ ہے کب تک یہ تغافل
کب تک یہ کہے جاؤ گے ہنس کر ابھی کچھ اور
مرتے ہیں مگر کیسے کریں عشق سے توبہ
کہتا ہے شباب اُن کا چمک کر ابھی کچھ اور

زاہد کو ہم سے رنج یہ بیکار تو نہیں
اس کو بھی تیرے عشق کا آزار تو نہیں
منہ کیجیے اس طرف میری جانب تو دیکھیے
جاں دے رہا ہوں دل کا طلب گار تو نہیں
جب کچھ نہیں تو کس لیے کہتے ہو بار بار
میکش تمھیں یہ عشق کا آزار تو نہیں

رہا گشتم ز ہر قیدے نہ گبرم نے مسلمانم
نہ بے قیدم نہ باقیدم نہ من اینم نہ من آنم
نمی خواہم وصالے را کہ انجامش بود ہجراں
توئی اے درد درمانم توئی اے سوز سامانم
زمینم من زمانم من مکینم من مکانم من
نہ من آنم نہ من اینم نہ من آنم

یہ آنکھ ہے یا جادو اے محوِ خود آرائی
انداز میں بیماری اعجاز مسیحائی
وہ تانے ہوئے ابرو وہ بکھرے ہوئے گیسو
کیا بات بگڑنے کی اللہ رے خود آرائی

دل کے ملنے میں تکلف یہ ادائیں کب سے
میرے کہنے ہی سے لے لو قسمیں عادت نہ سہی
وحشت دسوز تو ہے حسرت دلسوز تو ہے
نہ رہی گرچہ وہ شب اور وہ صحبت نہ سہی
ان کے چہرے سے ٹپکتا تھا مرا سوزِ نہاں
کچھ مرے مُنہ سے نہ نکلا دمِ رخصت نہ سہی

ہوا اُن کے دل پہ مگر اثر مرا جی جو اور گیا بگڑ
رہی اب نہ طاقتِ شور و شر مرے نالے کی یہ رسید ہے
نہ مرے سفر میں جہت کوئی نہ مرے حضر میں مقر کوئی
نہ ہے خواب گفت و شنید کا نہ خیالِ دانش و دید ہے
یہی زندگی کا مدار ہے کہ امید عیشِ بہار ہے
ابھی زندگی کی امید ہے یہی رنج و غم کی وعید ہے
رہے یاد حشر کے دن مری مجھے یوں پکارنا یا علیؑ
وہ کہاں ہے میکش حیدری غمِ عشق کا جو شہید ہے

پھر انھیں شوقِ خود نمائی ہے
کیوں مجھے عذرِ نارسائی ہے
رنگ نے اُن کے یہ ستائی ہے
خامشی میری رنگ لائی ہے
الفراق اے جنونِ عیش ونشاط
تشنگی میری ان کو بھائی ہے
ہیں سحر سے وہ محو آرائش
آج مہیش کی موت آئی ہے

1920

ترکش تیرِ ادا تھا دیدۂ بسمل نہ تھا
وہ مرا تارِ نظر تھا ناوکِ قاتل نہ تھا
آپ پر شیدا تھا بس اور مدعائے دل نہ تھا
تھا تماشائے فنا ہنگامۂ محفل نہ تھا
دیکھ کر رنگِ فنا افسردہ تھا حسرت نصیب
تھا مگر بیکس تمھاری بزم میں شامل نہ تھا

بہتر ہے غیر خوب کریں عشق آپ سے
اچھا ہے خوب صدمے اٹھائیں مری طرح
بیٹھیں خموش ادب سے رہیں تم سے دور دور
لوگ آئیں شوق سے مگر آئیں مری طرح

اس درجہ آبلے ہیں دل دردناک میں
دل سینے میں ہے خوشۂ انگور تاک میں
پار آکے ہجر میں مجھے دونا ہے اضطراب
تیری مناعتوں نے ملایا ہے خاک میں
دیکھیں گے ہم بھی معرکہ رہتا ہے کس کے ہاتھ
دل اُن کی تاک میں ہے وہ ہیں دل کی تاک میں
عشق بتاں وغیرت ناموس وپاس وضع
عاشق مزاج دل سے مرا دم ہے ناک میں

وہ آتے ہیں تو چھپتا ہوں وہ چھپتے ہیں تو مرتا ہوں
جنوں کا انتقام اللہ کس پہ ناز کرتا ہوں

نظر چین جبیں پر ہے کبھی ہونٹوں کو تکتا ہوں
تری خاموشی سے دم گھٹ گیا بیمار سکتا ہوں

کیا کریں گے وہ امتحاں میرا
با رہا آزمائے بیٹھے ہیں
میں ہوں سرکار مجرم اُلفت
آپ کیوں منہ چھپائے بیٹھے ہیں

مصیبت میں مجھے دیتے ہو طعنے آشنائی کے
ارے او ظالمو کیا وصل سمجھے ہو جدائی کو

وہ کہتے ہیں وفائیں میری تم کو روتی یاد آئیں
بھلا ہو کج ادائی کا دعا دو بے وفائی کو

ہوا موافق نہیں باغ جناں کی
خبر لادے کوئی کوئے بتاں کی
سحر سے دل نہیں ٹھہرا ہے میرا
ہوا آئی تھی کیا کہیے کہاں کی
قیامت آگئی اے بیکسی کیا
سفر میں یاد اور کوئی تتاں کی
وہ دزدیدہ نظر وہ مہر گفتگو
ستم ہے یاد عشق ناگہاں کی
وہ روئیں وقتِ رخصت اب ہمیں کیا
رسائی ہائے آہ ناتواں کی
ترے کوچے کی ہو جائے تو اچھا
خدا جانے یہ مٹی ہے کہاں کی
نہ پوچھیں آپ حالِ مرگ بیکس
عجب حالت ہوئی اس نوجواں کی

کوئی دن اب تو ہم بھی جذبِ دل کو آزمائیں گے
نہ جائیں گے کبھی جب تک نہ وہ ہم کو بلائیں گے
گئے وہ آہ ہم بھی اب چلے خوں ہو چلا دل بھی
سنا لیں اور کچھ ناصح کہ پھر ہم کو نہ پائیں گے

جگر پانی ہو یا دل خوں مجھے سب ناگوارا ہے
نہ ہو افسوس جب وہ ہی تو یہ کس کو دکھائیں گے

بس اے سوز دروں لازم ہے پاسِ دوری منزل
جو ان کا حال واں بگڑا تو وہ کس کو بلائیں گے

وہ مجھ کو دیکھ کر خوش ہونے والے کیا ہوئے میکش
رُلا کر اب مجھے ہمدم مرے کس کو ہنسائیں گے

اشک ندامت ہی رہے شام قیامت ہی رہی
آئی نہ موت اب تک ہمیں مرنے کی حسرت ہی رہی

بیگانہ کیوں ہونے لگا میں بزم گاہِ ناز سے
مانا کہ ارماں ہی رہا مانا کہ حسرت ہی رہی

بدلے سماں اے بے خبر کیا کیا نہ ہونے نے ترے
صبح وطن میں بھی ہمیں تو شامِ غربت ہی رہی

کیا جانیں ذوقِ دید ہم لیکن وہ اک پہلی نظر
جس دن سے ان سے دل ملا اُس دن سے فرقت ہی رہی

آئے ادھر اُدھر سے وہ اور وار کر گئے
ٹھہری یہی جو اُن کی ادا ہم تو مر گئے

ناکام جو تمھاری محبت میں مر گئے
سچ پوچھیے اگر تو بڑا کام کر گئے

آنکھیں ہیں بند اور تصور ہے آپ کا
مجھ کو اسی طرح سے مہینے گذر گئے

123

شرما کے منہ کو پھیر لیا مسکرا دیے
مرہم طلب کیا تھا وہ اور وار کر گئے
سنتے تھے ہم کر بعد قیامت ہے زندگی
جس دن سے لیکن آپ گئے ہم تو مر گئے

مثنوی زہرِ غم

(ناتمام)

اے خزانِ دل و بہارِ دل　　　نشترِ تیز اور قرارِ دل
دوستِ عشق و دشمنِ حسرت　　　خصمِ شیداؤ طالبِ اُلفت
دوستِ دشمناں و دشمنِ دوست　　　رہبرِ دشمناں و رہزنِ دوست
چھین کر دل نہ پوچھنے والے　　　وعدے کر کر کے بھولنے والے
نہ کروں آہ دُکھ سہوں کب تک　　　کیا کروں بے کہے رہوں کب تک

آیئے دیکھیے بہارِ جنوں　　　اُٹھیے سرکار پڑھ چکے افسوں

قطرۂ مہر بہرِ قطرۂ نم　　　مرے دل کو تری نگاہِ کرم
ہم سے خواہانِ عشق خود بیزار　　　دوسروں کا علاج خود بیمار

تمھیں وہ دن بھی یاد ہیں کہ نہیں
جب کہ ایسی جفائیں تم میں نہ تھیں

کون پہلے سلام کرتا تھا
کون پہلے کلام کرتا تھا

یوں ہی باتیں مجھے سناتے تھے
یوں ہی پہروں مجھے رُلاتے تھے

روٹھتا میں تو تم مناتے تھے
سو دفعہ دن میں گھر پہ آتے تھے

وہی تم ہو خدا کی قدرت ہے
وہی ہم ہیں ہماری قسمت ہے

یا وہ حالت تھی یا یہ صورت ہے
میری صورت سے تم کو نفرت ہے

دیکھ کر مجھ کو پردہ کر لینا
مارنا تیرا اور سپر لینا

اور اک دلخراش ہے یہ خبر
ہے تمھارا یہاں سے قصد سفر

شور ہے جب سے تیرے جانے کا
میں ہوں اور غم ہے تیرے آنے کا

تھا ادھر تیرا آنا کیا لازم
اور میرا ستانا کیا لازم

اور جو آنا ضرور ہی تھا تجھے
ہوتی الفت نہ یا نصیب مجھے

اور جو ہونی تھی تجھ سے الفت بھی
کیا ضروری تھی ہائے فرقت بھی

گر نہ تھا وصل آرزو تو تھی
دور تھے گرچہ پھول بو تو تھی

یہ نہ تھی قلب زار کی صورت
درد میں تھی قرار کی صورت

ہجر بھی تھا اُمید وصل بھی تھی
درد بھی تھا دوا کی شکل بھی تھی

اب خیالِ وصال رخصت ہے
دیدہ و دل میں اک قیامت ہے

دل اُمیدوں سے ہوگیا خالی
لُٹ گئی اس مکاں کی آبادی

پھر تم آؤ مجھے اُمید نہیں
اب مقدر میں میرے دید نہیں

اک دفعہ جا کے جاں نہیں جاتی
لوٹ کر پھر قضا نہیں آتی

تم تو مانو گے کیا نہ جانے کی
التجا ہے قضا سے آنے کی

کہاں وصل اور کہاں تن آسانی
مجھے اُلفت سے ہے پشیمانی

کسی کمبخت کی جو شامت آئے　　تو مسافر سے اپنے دل کو لگائے
اور اک خوفِ وقتِ رخصت ہے　　جان پر میری کیا قیامت ہے
ہائے وقت وداع کیا ہوگا　　موت کا وقت کون سا ہوگا
کچھ جیتا ہوں میں تو سب باتیں　　سامنے ہیں وہ ہجر کی راتیں
ہجر میں دل نہ جینے دیگا مجھے　　ہاں یہ قاتل نہ جینے دیگا مجھے

جتنے دن تم ہو یاں غنیمت ہے　　یہ غنیمت بھی لیکن آفت ہے
ہے سکوں میں مرے قصور فنا　　شمع سے اُٹھنے کو ہے دور فنا
سحر وصل شام فرقت ہے　　شامِ فرقت ہے یا قیامت ہے

یاد تم کو یہ خاکسار رہے　　یہ مری نظم یادگار رہے

وقت آخر پیامِ آخر ہے
آہ آخر سلامِ آخر ہے

ازابتدا تا 1919

محدود لا مکاں میں ہمارا خدا نہ تھا
کی جس کی حمد لائق حمد و ثنا نہ تھا
تو پاس تھا تو کون سے دکھ میں مزا نہ تھا
کب تھا وہ درد جو مرے دل کی دوا نہ تھا
خود بینیاں صحیح تکبر بجا درست
اچھے ہیں آپ دل بھی ہمارا بُرا نہ تھا
مرتے ہیں اُس کے ہجر میں یہ بھی زمانہ ہے
ہر دم تھا یار سامنے وہ بھی زمانہ تھا
اللہ بخشے میکش عاشق مزاج کو
سب کچھ سہی مگر وہ بتوں سے برا نہ تھا

کیا ہوا گر کوئی بسمل نہ رہا
دوست! خود تو بھی تو قاتل نہ رہا

لے کے دل قتل سے میرے منکر
کب رہی جان اگر دل نہ رہا
ہوں نگاہوں سے کبیدہ خاطر
شوقِ نظارۂ محفل نہ رہا
عشق کی میرے صداقت نہ رہی
آئینہ تیرے مقابل نہ رہا

کرتا کبھی نہ عفو میں خون اپنا روزِ حشر
شرمندہ تیری چشمِ پشیمان نے کیا

ہے دلیلِ عجز ہم سب خاکساروں کا غرور
یعنی ہے ہم کو تکبر منتِ قدوس کا
پوچھ لیتے ہیں وہ مجھ سے بیخودی میں حالِ دل
نام ہے گویا زباں بھی دل کے اک جاسوس کا
سوزِ دل کب چھپ سکا کب شعلہ پنہاں ہو سکا
جسم و دل میں ہے تعلق شمع اور فانوس کا
ظاہری خوبی ہی نے رسوا کیا تھا اس کو گر
پاک بدنامی سے جامہ ہوگا اب سالوس کا
ہر کمالے را زوال و ہر زوالے را کمال
دیکھیں کب بدلے زمانہ میکش مایوس کا

دیکھ کر مجھ کو پردہ کر لینا
مارنا تیر و سپر لینا

پہلے ان کا سلام کر لینا
دل مرا لے کے سر پہ دھر لینا
اس کے کوچہ میں خضر گر جانا
زندگی کا پیالہ بھر لینا
میری نظروں میں شام ہوتا ہے
ان کا شرما کے پردہ کر لینا
سر مرا کاٹ کر وہ کہتے ہیں
نخل اُمید کا ثمر لینا
مجھے بچپن ہی سے یہ سودا ہے
دینا دل اور درد سر لینا
او ستم کیش کس سے سیکھا ہے
سامنے آ کے پردہ کر لینا
سر تسلیم خم ہے لیں کہ نہ لیں
ہمیں ان کو سلام کر لینا

کس کس پہ تیرے عشق کا احسان نہ ہوگا
ہوگا بھی اگر کوئی تو انسان نہ ہوگا
نکلے گا نہ کیوں سامنے اس بت کے زباں سے
شکوہ بھی کوئی وصل کا ارمان نہ ہوگا
فقطوں سے مرے قول کی تنقیص نہ کرنا
نقصان جو ہوگا تمھیں نقصان نہ ہوگا
میکش تمھیں کیا کام ہے واعظ سے نہ اُلجھو
مغرور ہے کج بحث پشیمان نہ ہوگا

اے کہ از جود وجودت ہر وجودے فیضیاب
قطرہ قطرہ بحر گشت وذرہ وذرہ آفتاب
صد حجابات تعین ہستی و اسمائے ما
ما جدائیم از تو لیکن چوں حباب از موج آب
از سکوت بر سوال وصل فہمیدم ما
لن ترانی بہ زما مقصود موسیٰ را خطاب
رحم فرما بر غریب بیکس خستہ جگر
بہر سبطین ولی وشافع یوم الحساب

اچھا کیا تصور دندان یار نے
اُن کو ہنسایا مجھ کو رُلایا تمام رات
بھولے وہ ایسے یاد میں گزرا تمام دن
ایسے ہنسے کہ مجھ کو رُلایا تمام رات

بیدلہائے اجابت الامان
بیکس ہائے شب غم الغیاث

دل کی بے نوری سے ہے زینت تن
گھر جو خالی ہیں تو باز از آباد
شرم کر نام کی سب کہتے ہیں
دل ویراں کو میرے یار آباد

میرا سر پھوڑنا راس آیا ہے
آج تک ہے تری دیوار آباد
ہم سے قائم ہے مسیحائی تری
کر دعا حق سے کہ بیمار آباد

جھانک کر پھر وہ اسی طرز سے لے لے جان بھی
اس لیے بیٹھے ہیں ہم یار کی دیوار کے پاس
اپنے آنے کی میں کس طرح کروں ان کو خبر
قاصد نالہ کہاں عاشق بیمار کے پاس

جیتے جی روٹھنا اور ڈھونڈتے آنا پس مرگ
کس لیے آئے ہو اب اور جلانا پس مرگ
بس جنازے پہ بھی تم میرے نہ آنا ہرگز
نام کرنے کو محبت نہ جتانا پس مرگ
اس کے کوچے سے مری نعش نہ لانا کوئی
نیند کیوں آئے گی بدلا جو ٹھکانا پس مرگ

ناز و کرشمہ کس لیے بانکی ادائیں کس لیے
دل مرا چھیننے کو اک سیدھی نگہ ہی کم نہیں
صبر مجھے بھی آ گیا پہلا سا حال اب کہاں
دل کی جو پوچھتے ہو تم دل جو نہیں تم غم نہیں
جان کے سارا حال آپ طعنہ پہ طعنہ مجھ کو دیں
غیر تو پھر ہے غیر ہی بات کا اس کی غم نہیں

وعظ سنیں تو کیوں سنیں پند سنیں تو کیوں سنیں
غیر کی بات کیوں سنیں اپنا فسانہ کم نہیں
میکش نا مُراد بھی وضع میں اپنی ایک ہے
پورے ہو تم جفا میں گر وہ بھی وفا میں کم نہیں

نشاں جو ترے در کا پائے ہوئے ہیں
وہ دونوں جہاں کو بھلائے ہوئے ہیں
ستم سہہ کے بھی ہم ہیں مشتاق ان کے
وہ دل لے کے کیوں منہ چھپائے ہوئے ہیں
میں بلبل کا نالہ ہوں میکش جہاں میں
یہ سب گل مرے ہی ہنسائے ہوئے ہیں

جلا جاتا ہوں خود ہی آتش رشک تماشا میں
میں گویا بزمِ خوباں میں بہ رنگِ شمع محفل ہوں

اُٹھتے ہی جس کو موجِ فنا نے بٹھا دیا
میں وہ حبابِ قلزمِ آبِ بقا کا ہوں

ٹھہراؤں اپنے دل کو کہ اس گلعذار کو
رخصت کروں اُسے کہ شکیب و قرار کو
کیا ان کو اور کوئی ستم یاد آگیا
کیوں آج ڈھونڈتے ہیں وہ میرے مزار کو

جب شمع زندگی ہی کو تم نے بجھا دیا
پروا نہیں بُجھادو چراغ مزار کو
میکش بہت ہی متقی وپاک باز ہے
جانے نہ دینا تیر نظر اس شکار کو

وہ میرے جذبۂ دل کی ہی شکلِ ثانی ہے
پڑے جو مجھ پہ تمھاری نگاہ کیوں کر ہو

میری صورت سے تم کو نفرت ہے
جانے یہ کیا خدا کی رحمت ہے
میرا دل تھا دیا تھا لیتا ہوں
میرا دل ہے مری طبیعت ہے
پھر رہی ہے وہ بزم آنکھوں میں
یاد صحبت بھی خوب صحبت ہے
پوچھتے کیا ہو تم کہ موت ہے کیا
وہ بھی اک غمزدہ کی حسرت ہے
وہ گئے حشر جو اُٹھاتے تھے
وہ نہیں ہیں تو کیوں قیامت ہے
میرا پیغام لے کے جاتا ہے
پاسباں کی بھی آج شامت ہے
اے فسوں گر ترا کمال نہیں
دل کا دینا ہماری عادت ہے

پہلے میں نے جان دی تم پر ضرور اتنا تو ہے
اور جفا تم کو سکھائی ہاں قصور اتنا تو ہے
اب کہاں وہ روز عشرت اور کہاں ہیں ہم مگر
دل سے جاؤ گے کہاں دل میں سرور اتنا تو ہے
آپ کی محفل میں آنے کا ہوں میں مجرم مگر
آپ میرے دل میں کیوں آئے قصور اتنا تو ہے
شکل اُس مہوش کی ہے ہر دم مرے پیش نظر
شب اندھیری ہی سہی فرقت کی نور اتنا تو ہے
شہر خاموشاں میں وہ تھامے جگر آئے ہیں آج
خیر جذب دل کا اے میکش ظہور اتنا تو ہے

اب اور سلسلہ مری تدبیر کے لیے
زنجیر چاہیے مری زنجیر کے لیے
سینے سے پھر نکلنے نہ دے گا اسے کبھی
پیکان دل بنے گا ترے تیر کے لیے

جنوں میرا زلفیں تری اور ناصح
مقدر سے ہیں سب ہی اُلجھانے والے

ذرا شبنم دل نگاہوں سے بچنا
کہ یہ مہر روئے بتاں کی کرن ہے

نہ بے حجاب کبھی میں نے ان کو دیکھا ہائے
خیال میں بھی وہ آئے ہیں منہ چھپائے ہوئے
ہوا ہوں پیدا ہزاروں امیدیں لیکر میں
نکھیں جو سینے سے ہاتھوں میں ہے چھپائے ہوئے
لحد میں ساتھ لیے جارہا ہوں اے میکش
گلے لگانے کی حسرت گلے لگائے ہوئے

گئے تھے بزم میں ان کی بڑے بڑے ارادوں سے
یہی کہتے بنا آخر بہت بہتر نکلتے ہیں

وائے حسرت اک نظر میری طرف وہ دیکھ لیں
کاش آنکھوں ہی سے میں کہدوں جو میرے دل میں ہے

امتحان برشِ تیغ ستم کرتے ہو یا
مجھ سے حالت پوچھتے ہو تم دلِ ناشاد کی
وہ نہ چھوڑیں گے جفا مانا تو پھر بھی کیوں سنیں
میرے سینے میں اگر نکلے لوا فریاد کی
تم بھی سمجھے مسکرانا میکش مقتول کا
داد دیتا تھا تمھارے خنجر بیداد کی

اگر وحشت نہیں میری سی تجھ کو بھی تو پھر کیا ہے
مری آنکھوں میں کیوں ہر دم تری تصویر پھرتی ہے

خرابات وحرم میں آج کل تیرا ہی قبضہ ہے
تصور دل میں آنکھوں میں تری تصویر پھرتی ہے

یہ میری وحشت کا ہے اثر اب جنوں کو جس سے جنوں ہوا ہے
کہ میرے عقل کو خرد کی صورت فرار ایک ایک نقش پا ہے
کبھی ستم کو ستم نہ سمجھے فراق کو بھی الم نہ سمجھے
ہوئے جو بیخود تو ہم نہ سمجھے کہ ذوق ہجر و وصال کیا ہے
وہ اس طرح سے ہے جلوہ فرما کہ شور ہر سو ہے مار آئینہ
جو ہم سے مد نظر سے تھا چھپنا ظہور کا نام کیوں کیا ہے
ستم کا غم ہے غضب کی وحشت لکھوں میں کس طرح حال ان کو
کہ حرف کاغذ پہ جو لکھا ہے تو آہ بن کر وہ اُڑ گیا ہے
میں اپنی حالت پہ کیوں ہوں پرغم جہاں میں کوئی نہیں ہے خرم
جو دل ہے غنچوں کا تنگ ہر دم گلوں کا سینہ پھٹا ہوا ہے
یہ کمسنی تیری اور یہ مضموں یہ فکر سالم یہ طبع موزوں
ضرور حاسد کا دل ہو پرخوں کہ تو نے میکش غضب کیا ہے

لیا دل کیا جو تیرا دل نہیں ہے
میں ہی بسمل ہوں تو قاتل نہیں ہے
یہاں خلوت ہے ہم دونوں ہیں یکساں
زباں کو روکیے محفل نہیں ہے
میں ہی دیتا ہوں جاں میری ہی عادت
یہ میں نے مانا تو قاتل نہیں ہے

خلش ہے ہر گھڑی سینے میں میرے
ترا پیکاں ہے میرا دل نہیں ہے
خدا یا تجھ میں تو قدرت ہے اس کی
جو میکش بخشنے قابل نہیں ہے

عشق سے کون سا دن تھا کہ میں بیزار نہ تھا
کب دعا وصل کی تھی جس میں مناجات نہ تھی
کون سے دن تھی وفا تیری جفا سے خالی
کونسی تھی وہ جفا جس میں مدارات نہ تھی
قتل کرنے میں مرے دیر ہوئی کیوں اتنی
ایک آنکھوں کا اشارہ تھا کوئی بات نہ تھی
اب نہ بولوں گا جو مرضی نہیں تیری لیکن
بات کرنی مری تمہید شکایات نہ تھی
عام لوگوں نے نہ سمجھا تو نہ سمجھا میکش
کون سی بات تھی تیری جو بڑی بات نہ تھی

حرفِ تمنا

یہ میکش اکبر آبادی کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ جو عزیزی پریس آگرہ سے
جون 1955 میں طبع ہو کر منظر عام پر آیا۔ اس کی ترتیب بھی وہی ہے جو "میکدہ" کی ہے۔
جو 1930 سے لے کر 1955 تک کی پچھتر (75) غزلیں، باون (52) نظمیں اور
پانچ (5) رباعیوں پر مشتمل ہے۔

حرف اوّل

مدّت ہوئی جب میری غزلوں اور نظموں کا مجموعہ "میکدہ" آگرہ اخبار پریس میں چھپا تھا لیکن کسی وجہ سے اس کی اشاعت جیسی ہونی چاہیے تھی نہ ہو سکی اور جن ہاتھوں تک میں اسے پہونچانا چاہتا تھا نہ پہونچا سکا۔ مجھے ہی اس کی چند جلدیں میسّر آسکیں۔

میکدے کے بعد جو کچھ کہا گیا وہ ملک کے مختلف رسائل میں شائع ہوتا رہا اور اب "حرفِ تمنا" کے نام سے آپ کے سامنے ہے۔ اس سے قطع نظر کہ یہ رو برو کہا جا سکا ہے یا نہیں اس کا نام علامہ اقبال کے اس شعر ہی سے لیا گیا ہے ۔

فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا — حرفِ تمنا جسے کہہ نہ سکیں رو برو

میکدے کی ترتیب کا اسلوب یہ تھا کہ ابتدا سنِ رواں کے کلام سے تھی اور پھر سلسلہ وار گزرے ہوئے سنین کا کلام تھا اس طرح اختتام ابتدائی کلام پر ہوا تھا۔ اس زمانے کے بعض اہلِ نظر نے بھی اس ترتیب کو پسند کیا تھا۔ یہی ترتیب مجھے اب بھی موزوں معلوم ہوئی۔

اس مجموعے میں میکدہ بھی شامل ہے مگر مکرر حذف و اصلاح کے بعد میکدے کا پہلا ایڈیشن بھی میرے پورے کلام کا مجموعہ نہ تھا۔ اسی طرح اب بھی بہت سی غزلیں بہت سی نظمیں اور بہت

سے اشعار قلمزد کر دیے گئے ہیں کچھ تو اس لیے کہ میرے موجودہ مذاق کے مطابق نہ تھے اور کچھ اس لیے کہ اگر چہ میں کثرت میں حسن تسلیم کرتا ہوں مگر کثرت کو حسن تسلیم نہیں کرتا۔

یہ انتخاب میں نے ہی کیا ہے یا مجھی کو کرنا پڑا ہے۔ایک شاعر کے لیے اپنے اشعار کا انتخاب کتنا مشکل ہے اس کا اندازہ ہر شخص نہیں کر سکتا اور خصوصیت سے یہ اشعار تو اس کی زندگی کا رس ہیں جس میں اس کے غم اور مسرتیں ہیں، بہاریں اور خزائیں ہیں، اہلِ دل کی صحبتیں ہیں۔ادیبوں اور شاعروں کی محفلیں ہیں، دوستوں محبوبوں اور محبت کرنے والوں کی مجلسیں ہیں۔دلوں کے نشتر اور مرہم ہیں خواب اور حقیقتیں ہیں اپنے دل کا سوز اور کائنات کے دل کی دھڑکن ہے وہ پھول ہیں جن کی طرف شاعر نے ہاتھ بڑھائے تھے وہ کانٹے ہیں جو چبھے تھے اور وہ خون کے قطرے ہیں جو ہاتھوں سے ٹپکے تھے۔ پھر ان میں سے کتنی ہی تصویروں کو اپنے ہاتھ سے قلمزد کرنا پڑا ہے اور کتنے ہی ہاروں کی لڑیوں کو انھی ہاتھوں سے توڑنا پڑا ہے جن ہاتھوں نے انھیں گوندھا تھا پھر بھی کہیں کہیں ہاتھ سے قلم چھوٹ پڑا ہے اور بعض اشعار شامل کرنے ہی پڑے ہیں۔

غرض یہ ایک مرقع ہے جس میں مٹے ہوئے اور گزرے ہوئے حسین لمحات کو حیاتِ دوام بخشنے اور کبھی لوٹ کر نہ آنے والے جمال کو شیشے میں اُتارنے کی کوشش کی گئی ہے تا کہ کائنات کو حسین اور اس کے حسن کو جاوداں بنایا جا سکے۔

میرے سامنے ادب کے کئی رجحانات ابھرے اور مٹے ہیں۔سیاست اور تہذیب نے کئی پلٹے کھائے ہیں۔ میں نے ان سب کا مطالعہ کیا ہے ایک تماشائی کی طرح نہیں بلکہ ایک فریق کی طرح اور اس میں سے مجھے جو بھی بہتر معلوم ہوا اسے اپنے ذہن و شعور میں سمونے کی کوشش کی ہے۔اسی طرح میں ہر زمانے میں خود اپنی تخلیقات پر تنقیدی نگاہ ڈالتا رہا ہوں لیکن ظاہر ہے کہ یہ نگاہ ایک ناقد کی سی نہیں بلکہ ایک فن کار ہی کی سی ہو سکتی تھی جو وہ اپنے فن پارے پر ڈالتا ہے۔اور اپنے ہی قلم سے اس میں ترمیم و تنسیخ کرتا رہتا ہے پھر بھی ہر فن کار کا ایک مزاج ایک نظریہ اور ایک اصولِ نقد ہوتا ہے۔اسی پر میں نے اپنے کلام کو پرکھا اور جو بہتر سمجھا اُسے پیش کیا ہے۔ معلوم نہیں کہ مجھے ادب کے کس حلقے اور کس طبقے میں جگہ دی جائے گی۔ بہر حال وہ جگہ آپ میرے کلام ہی سے متعین کریں گے نہ کہ میرے دعوے سے۔آپ اس کلام میں مجھے بھی

دیکھیں گے اور اپنے آپ کو بھی لیکن میں ہر حالت میں اپنے عیوب دیکھنے کا عادی اور اپنی غلطیوں کے معلوم کرنے کا خواہشمند رہتا ہوں کیونکہ میرے حالات اور رجحانات نے مجھے شاعری کی ابتدا میں کوئی استاد میسر نہ آنے دیا لیکن میری صحبتیں ہندوستان کے مشاہیر شعرا اور اہل علم سے مخلصانہ رہیں اور ان صحبتوں سے میں نے بہت کچھ حاصل کیا۔ فن عروض سے میں جتنا بھی واقف ہوں اس کا بھی شدت سے پابند نہیں ہوں۔ اسی طرح الفاظ کے ترک واختیار میں کسی کا مقلد نہیں میری زبان اپنی اور اپنے شہر کی ہے۔

زندگی کے اس لق ودق میدان میں جب میری آنکھ کھلی تو موسم، حالات اور گردوپیش کوئی بھی موافق نہ تھا۔ میرے چاروں طرف ایک ایسا طوفان چھایا ہوا تھا جس میں کچھ بھی نظر نہ آتا تھا اور ہمارے مختصر قافلے کو ایک طویل سفر درپیش تھا جس کی منزل بھی متعین نہ تھی۔ موسم اور ماحول سے جنگ کرنی تھی جس نے تاریکی کے پہاڑ ہمارے چاروں طرف کھڑے کردیے تھے راہ زنوں سے لڑنا تھا جو ہماری زندگی کے سوتوں پر قابض ہو چکے تھے اور ان تماشائیوں سے بھی دو دو ہاتھ کرنے تھے جو قدیم اور فرسودہ مذہبی اور خاندانی روایات کے انبار میں ہمیں دبانا چاہتے تھے۔ یہ دور ختم ہوگیا مگر بعض یادگاریں چھوڑ گیا جن میں سے ایک وہ مزاج بھی ہے جو ان واقعات نے بنادیا جسے آپ نے اپنے احساسات اور جذبات کی بنا پر مختلف نام دے سکتے ہیں کیونکہ خیر وشر کے تعین میں حقیقت کے علاوہ بہت کچھ انحصار آپ کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی پر ہے۔ آپ اسے باغیانہ بھی کہہ سکتے ہیں اور کچھ اور بھی۔ اس مزاج کی جھلکیاں آپ میرے بعض اشعار میں دیکھیں گے اور کیف ومستی کے ساتھ کسی جام میں آپ خونِ دل کی تلخی بھی محسوس کریں گے بقول میر

دل پرخوں کی اک گلابی سے
عمر بھر ہم رہے شرابی سے

اس کے علاوہ مختلف زبانوں اور ان کی ادبیات مختلف مذاہب اور فلسفے اور ان کے نظریات کے مطالعے نے مجھے ایک ایسی نظر اور ایک ایسا دل عطا کیا ہے جو سب کے ساتھ ساز کرسکتا ہے اور سب سے ہمدردی رکھتا ہے۔

یہ اتفاق ہے کہ میرا نظریہ اور عقیدہ وحدت کائنات ہے جس میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ تمام ترقی پسند نظریات سے ہم آہنگ ہوسکتا ہے اور متضاد نظریات میں صلح کرا سکتا ہے کیونکہ یہ نظریہ تمام کائنات سے محبت سکھاتا ہے۔ کائنات کو حسین تر بنانے کی ترغیب دیتا ہے اس کی رو سے مجاز اور حقیقت، مادہ اور روح یا شعور ایک ہی شے کے مختلف مظاہر ہیں۔ اور ان میں سے کسی سے بھی قطع نظر درست نہیں نہ وہ درختوں کے نظارے میں جنگل کو فراموش کرتا ہے اور نہ جنگل کے مشاہدے میں درختوں کو "مشاہدات آب وگل" کو فانی کی طرح "تجلیات وہم" اور مرزا غالب کی طرح ہستی کو "ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے" "نہیں سمجھتا" بلکہ وہم باطل بھی حق تو یہ ہے تو ہی ہے۔" کا قائل ہے۔ حسن کائنات اور حسن کائنات کے حاصل یعنی انسانیت سے محبت اور اس کی تکمیل اُس کا انتہائی نصب العین ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسی نظریے کی روشنی میں ادب کے متعلق میرا نظریہ متعین کرنا زیادہ بہتر ہوگا۔

جب بھی اس مجموعے کی طباعت کا سوال پیدا ہوا میری سہل انکاری اور بے معنی مشغولیت مانع آتی رہی۔ مختلف بیاضوں سے کلام کا انتخاب اس پر نظر ثانی اور سب سے زیادہ اس کا دوبارہ نقل کرنا میرے لیے مشکل تھا۔ ایک مرتبہ (غالباً 1944 میں) نواب صاحب مانا ودر (کاٹھیاواڑ) نے اس مجموعے کی طباعت کے لیے ارشاد فرمایا تھا لیکن میں کئی سال اسے ترتیب ہی نہ دے سکا اور آخر وہ ریاست ہی انقلاب کی نذر ہوگئی اور اب بھی اگر نواب مولوی محمد جان خانصاحب شیروانی رئیس دادوں اس کی اشاعت کی بار بار تاکید اور مصارف طباعت کی کفالت نہ فرماتے تو نہ معلوم یہ مجموعہ کب شائع ہوتا مجھے مسرت یہ ہے کہ نواب صاحب کا یہ اقدام میری گذارش یا اس شفقت ونوازش کی بنا پر نہیں ہے جو وہ مجھ پر فرماتے ہیں۔ بلکہ ان کی سخن سنجی اور ناقدانہ مذاق کی بلندی اس کی متقاضی ہوئی اور ان کی عدیم المثال حس جمال نے انھیں اس پر آمادہ کیا۔ لیکن مجھ پر موصوف کا شکریہ واجب ہے اور میں اس کے لیے انتہائی ممنون ہوں۔

میکش اکبرآبادی

11/مئی 1955

غزلیں

رات اس محفل کا عالم کیا کہوں
بات افسانہ تھی خاموشی فسوں

تجھ سے اپنی زندگی کے ماجرے
ٹھہر ہمدم سانس لے لوں تو کہوں

ہم نے لالے کی طرح اِس دور میں
آنکھ کھولی تھی کہ دیکھا دل کا خوں

آپ کی میری کہانی ایک ہے
کہیے اب میں کیا سناؤں کیا سنوں

آپ کا انجان پن بھی ایک فن
اور میری عقل و دانش بھی جنوں

دیکھتا ہے تیرا یہ عالم مجھے
چاہے یہ نکلے مری آنکھوں سے خوں

ہے زمانہ اپنے غم میں مبتلا
کس سے میکش جا کے اپنا غم کہوں

وہ سوزِ عاشقی کا زمانہ گزر گیا
وہ فتنہ وہ فسوں وہ فسانہ گزر گیا
ٹوٹے وہ ساز اور وہ سانسیں اُکھڑ گئیں
وہ دُھن وہ نغمہ اور وہ ترانہ گزر گیا
موجِ ہوا سے جب چھلک اٹھتا تھا دل کا جام
وہ جوشِ مے وہ فیضِ مغانہ گزر گیا
جب سازِ غم کے تار نج اُٹھتے تھے خود بخود
اب وہ مقامِ چنگ وچغانہ گزر گیا
وہ دن کی شورش اور وہ وحشت ہوا ہوئی
وہ آنسوؤں کا سیل شبانہ گزر گیا
وہ گیسوؤں سے ہوش گنواتا ہوا تمام
وہ آنچلوں سے ہوش میں آنا گزر گیا
جب ایک جستجو کے سوا کام ہی نہ تھا
وہ فرصتوں کا عہد شہانہ گزر گیا
زُلف و کمر وہی ہے مگر اب وہ دل کہاں
باقی ہیں تیر اور نشانہ گزر گیا
خود سے زیادہ اب مجھے اوروں کی فکر ہے
جب خود ہی گم تھا میں وہ زمانہ گزر گیا
1955

یہ مانا زندگی میں غم بہت ہیں
ہنسے بھی زندگی میں ہم بہت ہیں

تری زلفوں کو کیا سلجھاؤں اے دوست
مری راہوں میں پیچ و خم بہت ہیں
نہیں ہے منحصر کچھ فصلِ گُل پر
جنوں کے اور بھی موسم بہت ہیں
غبار آلودہ چہروں پر نہ جانا
انھیں میں کے قبا دو جم بہت ہیں
کروں کیا شکوہ تیری بے رُخی کا
کہ دل کو بے سبب بھی غم بہت ہیں
مجھے کچھ ساز ہے نشتر سے ورنہ
مرے زخموں کے یاں مرہم بہت ہیں
قفس پہ جان کر توڑا تھا میں نے
قفس کو توڑ کر بھی غم بہت ہیں
کروں کیا چارہ ان آنکھوں کا میکش
کہ اُن کے سامنے پُرنم بہت ہیں

بہ اندازِ نسیم آئے بہ عنوانِ بہار آئے
وہ اپنے وعدۂ فردا کا بن کر اعتبار آئے
چراغِ کشتہ لے کر ہم تری محفل میں کیا آتے
جو دن تھے زندگی کے وہ تو رستے میں گزار آئے
خزاں میں آئے، بیٹھے خاکِ گُل پر، سوئے کانٹوں پر
سلام اپنا بھی کہہ دینا جو گلشن میں بہار آئے
یہ کہنہ جام و ساغر کیسے بدلیں ہاں مگر ساقی
تری محفل میں آئے انقلاب اور بار بار آئے

تری جانب نہ دیکھا ہم نے تیرے دیکھنے پر بھی
تری بھولی ہوئی غفلت کا ہم صدقہ اُتار آئے
یہ جبر و اختیارِ عشق ہے تم اس کو کیا سمجھو
رہے گا دل پہ کب قابو جو تم پر اختیار آئے
جہاں گھٹتی ہے اے گلچیں گلوں کی تاب ہی کتنی
مگر اے کاش یہ گلشن تجھے ہی سازگار آئے
تری محفل ہے اور میکش یہی دُنیا یہی عقبیٰ
یہیں سے بے قرار اُٹھے یہیں پھر بے قرار آئے
1954

مرا قصور کہ ہوں اس فضا میں متوالا
یہ رُخ یہ زُلف یہ چشمِ سیہ یہ دوبالا
ترے سہی یہ مگر تیری بو نہیں ان میں
یہ نسترن ہے یہ گل یہ سمن ہے یہ لالا
بڑھا دیے مری جانب گلوں نے پھر رخسار
کہاں ہوا تھا ابھی خشک ہونٹ کا چھالا
تمام عمر جسے دل بنا کے رکھا تھا
وہ راز آج یونہی ہم نے اُن سے کہہ ڈالا
ہوں تلخ کام طلب سے بہت میں اے ساقی
اب اپنا جام تو ہی میرے پاس سرکالا
ترے زمانے میں دانائے راز میں ہی ہوں
کہ میرے پاؤں میں زنجیر لب پہ ہے تالا

ہزار شمعیں شبِ انتظار میں دیکھیں
کہ جو چراغ جلایا وہی بُجھا ڈالا

دنیا میں کوئی اہلِ نظر کیا رہا نہیں
وہ سامنے ہے اور کوئی دیکھتا نہیں
ایسا بھی انقلاب جہاں میں ہوا نہیں
دن ہوگیا ہے اور اندھیرا گیا نہیں
تم نے بھی کچھ سُنا ہے مرے دل کا ماجرا
ہے ہر زباں پہ اور کسی نے کہا نہیں
مانا کہ میں زمانے میں مجبور ہوں مگر
یہ خیر ہے کہ تم بھی کسی کے خدا نہیں
آج اپنے آشیانے میں بُلبل ہے بے وطن
صیاد کے بھی عہد میں ایسا ہوا نہیں
ایمان ہے مرا تری جنت پہ اے خدا
لیکن یہ میرے خون جگر کا صلا نہیں
میکش مرا بیان زمانے نے سُن لیا
ہے جس کا ذکر صرف اسی نے سُنا نہیں

وہی ہے میری سحر اور وہی ہے میری شام
وہی ہے جامِ ہلاہل وہی ہے تلخیِ جام
بڑھے ہی جاتی ہیں تاریکیاں ترے دل کی
مگر قریب ہے اب میری رات کا انجام

154

بغیر گریۂ مکمل ہنسا نہ گل کوئی
بغیر جہد کے بدلا گیا نہ کوئی نظام
کوئی یقیں کبھی محکم نہ بے عمل کے ہوا
کہ بے عمل کے یہ سارے یقین ہیں اوہام
اگر جنونِ محبت نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکر و فکر یہ صوم و صلاۃ یہ احرام
کسی طرح سے زمانہ مجھے مٹا نہ سکا
ہزار بار دیا اس نے مجھکو زہر کا جام
گئے رزی سے سخن فہم سوئے پاکستان
سنائے میکش مجبور کس کو اپنا کلام

1953

مرے ہوش میں وہ ٹھہرے سے نہ کبھی پھر ہوش کے دن ہی بیت گئے
وہ آئے گئے تو بہت لیکن بے رُت آئے بے رُت گئے
انجان سے تھے ہم تم دونوں پھر ہم تم دونوں ایک ہوئے
اب یہ بھی نہیں اور وہ بھی نہیں دونوں ہی زمانے بیت گئے
کوئی اور ترانہ اے مطرب اب اُن گیتوں کو کیا گانا
وہ دُھن بھولی وہ سُر بدلے وہ ساز ہٹے وہ گیت گئے
اب ملنے پر کیا پچھتاوا کچھ تم بھی جھکے کچھ ہم بھی جھکے
ہارے تو دونوں ہار گئے جیتے تو دونوں جیت گئے
دُنیا کھوئی مذہب چھوڑا کیا خوب محبت کی میکش
اچھے تھے وہی جو اس دُنیا میں آئے اور بن پریت گئے

محوِ خوابِ خلوت ہیں پرسکون دنیا ہے
حُسن بے تجلّی ہے عشق بے تماشا ہے
تیری بزم میں اے دوست دین بھی ہے دنیا بھی
اپنے دل کی کیا کہیے دین ہے نہ دنیا ہے
اتنے فاصلے سے تو موج بھی ہے دریا بھی
ڈوب کر کوئی دیکھے موج ہے نہ دریا ہے
وہ ابھی ہیں خلوت میں اور محو ہے محفل
انتظارِ جلوہ بھی جیسے کوئی جلوا ہے
وعدہ خود کرم ہی ہے اعتبارِ وعدہ کیا
انتظارِ فردا کیا آج خود ہی فردا ہے
تیرے حُسن رب شاہد تو بھی ہے زمانہ بھی
دوست! ذوقِ میکش کا حسن کس نے دیکھا ہے

جو چپ رہیے تو ممکن ہے کہ وہ کافر نہ پہچانے
جو کچھ کہیے تو پھر بھولے فسانے یاد آئیں گے
1950

تم مضطرب نہیں مرے حالِ تباہ سے
دیکھو ذرا نگاہ ملا کر نگاہ سے
دیکھا تو ہوگا تم نے ہمارا مقام بھی
گزرے کبھی تو ہو گے محبت کی راہ سے
بزمِ جہاں میں کوئی تجلّی دلنواز
بچ کر کبھی گئی نہ ہماری نگاہ سے

قائم ہے یہ جہاں تری عصمت ہی سے مگر
رونق جہاں کی ہے مرے ذوقِ گناہ سے
وہ دل رہینِ کشمکشِ اضطراب و کیف
وہ عذر بے رخی نگہ گاہ گاہ سے
سب کچھ ہے اور کچھ نہیں اے دادخواہِ عشق
وہ دیکھ کر نہ دیکھنا نیچی نگاہ سے

وہی ناقدریِ اربابِ صفا آج بھی ہے
دار و زنجیر صداقت کا صلا آج بھی ہے
اُٹھ گئے غیر بھی کے تری محفل سے مگر
رنگ محفل کا ہمیشہ سے جو تھا آج بھی ہے
عشق پہ سوز نہیں عقل جنوں خیز نہیں
تابِ رخسار و خمِ زلفِ دوتا آج بھی ہے
میں نے گلشن کے لیے آپ کو بدلا لیکن
مجھ سے بدلی ہوئی گلشن کی فضا آج بھی ہے
دہر سے کب کا گیا قافلۂ آدمیت
ہاں مگر معرکۂ بانگ و درا آج بھی ہے
1949

جو کسی پہ آپ نہ کر سکے مجھے اس جفا کی تلاش ہے
رہے جس سے آپ بھی بے خبر مجھے اس ادا کی تلاش ہے
جو ترے جمال پہ چھا سکے مجھے اس بقا کی ہے آرزو
ترا حُسن جس میں سما سکے مجھے اس فنا کی تلاش ہے

ہے تمام خواہش و جستجو یہ مرے جنون کی انتہا
جو ہوئی تھی تیری نگاہ سے اُسی ابتدا کی تلاش ہے
مرے ہوش میں جو نہ آسکا جو مرے جنوں سے نہ جاسکا
اُسی بے وفا کی ہے جستجو اُسی آشنا کی تلاش ہے
کہاں تو نے میکش مست کو کیا گم کہ تیری نگاہ میں
اُسی غمزدہ کی ہے جستجو اُسی مبتلا کی تلاش ہے

وہ دن کہ تو بھی تھا مری بے تابیاں بھی تھیں
کچھ بھی نہیں ہے اب تو ترے نام کے سوا
جس نامے کو لکھا تھا تمنا نے عمر بھر
خود تھا ہی کیا وہ حسرتِ پیغام کے سوا
1946

ترا حجاب اُٹھانا ہے صرف میرا کام
اگر چہ ہے مری ہستی ترے حجاب کا نام
مرے فسوں نے دکھائی ہے تیرے رُخ کی سحر
مرے جنوں نے بنائی ہے تیری زلف کی شام
ترے سکوں نے دیا دہر کو خیالِ ابد
کہاں ہے ورنہ مرے اضطراب کا انجام
یہ کائناتِ زمان و مکاں سفر ہی سفر
نہ عاشقی مری منزل نہ حسن تیرا مقام
ہر اک مقام میں ہشیاریوں کی داد نہ چاہ
یہ غفلتیں بھی ہیں اپنی جگہ بڑا انعام

چمن میں سب سے ملی اور گزر گئی سب سے
لیے ہوئے تھی مری خو نسیم نرم خرام
تری نگاہ کی مستی سے دل ہے آوارہ
ہوا خراب اسی میکدے میں میرا جام
چمن میں کر نہ سکیں گے وہ مجھ سے قطع نظر
کہ خار میری تمنا ہیں پھول میرا پیام
ترے کرم کا بہت شکریہ مگر اے دوست
بغیر فصل کی بارش ہے دل کو تیرا پیام
فقیہا ہیچ ہے میکش سے تیری ہر حجت
وہ آپ اپنا مقلد ہے آپ اپنا امام

ہستی میرے دم سے ہے ہستی دنیا کا نام نہیں
ساقی کیسا مے ہی نہیں جب بادہ کیا گر جام نہیں
شعلۂ شوخ و شنگ نہیں یہ جامِ مئے گلفام نہیں
فرصتِ نائے ونوش کہاں یہ راہ ہے یاں آرام نہیں
جانے ہم کس دھیان میں تھے محفل میں تمھاری آ نکلے
پوچھتے کیا ہو دل کا مقصد دل کو کسی سے کام نہیں
دل کی تمنا بر آئی تفصیل اب اس کی کیا کہیے
جام تھا جب ساقی ہی نہ تھا اب ساقی ہے تو جام نہیں
دین ہی سے منہ موڑا تھا تو کفرِ محبت کیوں چھوڑا
کیا مذہب ہے اے میکش جو کفر نہیں اسلام نہیں

1945

نہیں وقت کے مطابق یہ مزاج معصمانہ
تو بدل دے اپنی خو بھی کہ بدل گیا زمانہ
تو اگر بُرا نہ مانے تو میں تجھ سے صاف کہہ دوں
کہ نہیں ہے سب حقیقت مری خوئے عاشقانہ
ہے بلند تو جو مجھ سے تو تلاش کر کوئی گھر
کہ زمین وآسماں تو ہے مرا غریب خانہ
نہیں تیرا زعمِ رندی ابھی معتبر کہ تیری
نہ نگاہ عارفانہ نہ ضمیر باغیانہ
میرے دل سے مٹ نہ جائے کہیں شدتِ بیاں سے
میرے حرفِ آرزو کو نہ بنائیے فسانہ

نہیں ہے گرچہ یقیں تری بات پر دل کو
ہے پھر بھی ذات تری میری روح کا ایماں

زہے مقدرِ عصیاں کہ تو فرشتہ نہیں
ہزار شکر تمنا کہ تو بھی ہے انساں

سنبھالیے رُخِ زیبا کی تابِ خود داری
مری نظر میں بغاوت ہے اے شہِ خوباں
نہ کر تلاشِ حقیقت نگاہ و دل کو سنبھال
کہ جو بھی ہے ترے ظاہر وہی تو ہے پنہاں

اک دل ہوں دو جہاں کے برابر لیے ہوئے
اک غم ہوں سو دلوں سے فزوں تر لیے ہوئے
خود تجھ سے بھی سنبھل نہ سکی جو تری نظر
مدت سے دل میں ہوں میں وہ نشتر لیے ہوئے
وہ مجھ کو ڈھونڈتے ہیں مگر دیکھتے نہیں
پلکوں پہ اک نگاہِ مکرر لیے ہوئے
1944

حُسن ہوگیا آخر عشقِ رائیگاں اپنا
بن گیا نشاں ان کا مٹ کے ہر نشاں اپنا
میں جہاں سے اُٹھا ہوں ذوقِ رنگ و بُو لیکر
کیا ہوا جہاں تیرا ڈھونڈ اب نشاں اپنا
ابتدائے جادہ پر پھر پلٹ کے آ پہونچا
کامیاب منزل ہے آج کارواں اپنا

ہر قدم اُٹھاتا ہے اُن کے چشم و ابرو پر
ان کا آدمی نکلا میر کارواں اپنا

کس طرح ہوئے رسوا حُسن وعشق کیا کہیے
حسن انکا رازِ دل رازِ دل عیاں اپنا
حالِ آرزو کیا ہے کیا بتائیں اے میکش
آنکھ فتنہ گر ان کی دل ہے بے زباں اپنا

نہیں ہے فرق کوئی مرہم اور نشتر میں
تری نگاہ کو مرہم بنا کے دیکھ لیا
کسی کے ہاتھ کا طالب ہے اب ترا دامن
کسی کے ہاتھ سے دامن چھڑا کے دیکھ لیا
نہیں ہے دل کا سکوں قسمتِ تمنا میں
تمھیں بھی دل کی تمنا بنا کے دیکھ لیا
نہ گر سکی کوئی بجلی مرے جنوں کے بغیر
تمھارے جلووں نے ایمن بنا کے دیکھ لیا
نہیں ہے عشق کی قسمت میں سوءِ ظن کے سوا
اُنھیں ہنسا تو چکے تھے رُلا کے دیکھ لیا

تلخی جو مرے دل میں غمِ زیست نے گھولی
وہ میں نے تمنا کی حلاوت میں سمو لی
چھڑکا مرے دامن پہ مرا خونِ تمنا
کیا ایسے ہی ہوتی ہے ترے راج میں ہولی
پکڑا ہی گیا چور توجہ کا سرِ بزم
کھیلے تھے نگاہوں سے مری آنکھ مچولی
یوں مست نگاہوں سے نہ کر دست درازی
پیراہنِ تمکیں کی مسک جائے نہ چولی
جو اُس کے ارادے میں نہ مرہم تھی نہ نشتر
میں نے وہ نظر آپ ہی سینے میں چبھو لی
گلشن تھا نہ محفل تھی نہ ساقی تھا نہ میکش
جھپکا کے ذرا میں نے پلک آنکھ جو کھولی

کچھ اس غضب کی لگاوٹ تھی ان نگاہوں میں
فریب ترکِ تمنا بھی آزما نہ سکے
وہ آپ اپنا رقیب اور یہاں یہ دل مجرم
جو سر اُٹھا بھی سکے تو نظر ملا نہ سکے
زباں پہ نامِ محبت بھی جرم تھا یعنی
ہم اُنؐ سے جُرمِ محبت بھی بخشوا نہ سکے
عجیب چیز ہے تاثیر میری اُلفت کی
وہ پاس رہ نہ سکے اور دُور جا نہ سکے
نہ اُن کی نیم نگاہی کی زد پہ دل آیا
وہ اپنے تیرِ شکستہ کو آزما نہ سکے

جام لا جام کہ عالم گزراں ہے ساقی
بادہ دے بادہ کہ غم دل پہ گراں ہے ساقی
کیا غمِ زیست کہ جز وہم و گماں کچھ بھی نہیں
کیا غمِ حشر کہ یاں ہے سو وہاں ہے ساقی
کل سنوں گا غمِ فردا بھی جو فرصت ہوگی
لا مرا ساغرِ امروز کہاں ہے ساقی
رازِ خلوت کو عیاں کیوں۔ سرِ محفل نہ کروں
میرے مذہب میں عیاں عینِ نہاں ہے ساقی
کوئی غم غیرِ غمِ بادہ نہیں مجھ کو حلال
یہ غمِ سود وزیاں دل کا زیاں ہے ساقی

یہ حقیقت کی جوانی یہ مئے حُسنِ مجاز
حق تو یہ ہے کہ یہاں ہے سو کہاں ہے ساقی
میری رندی ترا بہکا ہوا اک غمزۂ شوخ
میری مستی ترا اک رازِ نہاں ہے ساقی
پی کے جب گرنے لگوں میں تو ذرا دھیان رہے
سر مرا خوگرِ آغوشِ بتاں ہے ساقی

جمع ہے سارا زمانہ تری میخانے میں
آدمی کہتے ہیں جس کو وہ کہاں ہے ساقی
میرے فرہاد کو اب ساز نہیں شیریں سے
دلِ محنت پہ یہ سرمایہ گراں ہے ساقی
تیرے میکش کو نہیں خواہشِ عیشِ دو جہاں
بادہ خود مایۂ عیشِ دو جہاں ہے ساقی

کبھی اہلِ جنوں بھی مصلحت سے کام لیتے ہیں
تمھیں جب یاد کرتے ہیں خدا کا نام لیتے ہیں
وہ مستِ ناز جب دزدیدہ نظروں سے پلاتا ہے
خودی والے بھی دستِ بیخودی سے جام لیتے ہیں
قیامت دم بخود ہے غمزۂ ترکانہ ششدر ہے
خدا کے سامنے وہ آج میرا نام لیتے ہیں
رہِ اُلفت میں ہر ہر گام پر لغزش ہے میکش کو
سُنا یہ ہے کہ وہ گرتے ہوؤں کو تھام لیتے ہیں

کہوں گا میں تو تجھے آدمی کہیں گے بُرا
کہ مجھ کو تجھ سے محبت ہے آدمی کی طرح
1943

جام کا اعتبار کیا کام و دہاں بھی کچھ نہیں
دیر و حرم کو کیا کہوں کون و مکاں بھی کچھ نہیں
سوزِ نہاں بھی کچھ نہیں حسنِ عیاں بھی کچھ نہیں
یعنی یہاں بھی کچھ نہیں اور وہاں بھی کچھ نہیں
یہ بھی تری نگاہ سے وہ بھی ترے خیال سے
جوشِ جنوں بھی کچھ نہیں دردِ نہاں بھی کچھ نہیں
ذوقِ نیاز تک رہیں حُسن کی بے نیازیاں
میرا جہاں تو تھا ہی کیا تیرا جہاں بھی کچھ نہیں
تم ہو سرورِ دل سہی تم ہو سکونِ جاں مگر
یہ میرا دل بھی کچھ نہیں یہ مری جاں بھی کچھ نہیں
کرکے تباہ جان و دل دردِ نہاں ملا مجھے
آگئے پاس تم تو اب دردِ نہاں بھی کچھ نہیں
آپ ہی خود سنبھال لے آکے حدودِ ناز کو
ہو گیا گم جو میں تو پھر تیرا نشاں بھی کچھ نہیں
خود مرا مدّعا بتا خود ہی اسے قبول کر
میری دُعا بھی کچھ نہیں میری زباں بھی کچھ نہیں

کلی کھل کر بکھر جاتی ہے خوشبو
مسرّت سے ہے افسردہ مرا دل

وہاں کی صبح ویراں کو نہ پوچھو
جہاں شب کو سجائی جائے محفل
گلوں کے رُخ کا غازہ اشکِ شبنم
ہے سوزِ شمع سازو برگِ محفل
فروزاں دن ہے تاریکیِ شب سے
سکوتِ بحر سے ہے شورِ ساحل
1942

تو ہی ہے میرا یقیں میرا دین میرا شہود
ترے سوا کسی شے کی نمود ہے نہ وجود
یقین کفر پہ کافر کو بے ترے نہ ہوا
تو ہی حقیقتِ باطل تو ہی عدم کا وجود
ہر اک حجاب سے نکلی نوائے الااللہ
کمالِ کفر نے چھیڑا جو سازِ لا موجود
ہر ایک سمت ترا رُخ ہر ایک رُخ تری ذات
کروں میں کس کی طرف پشت کس کی سمت سجود
جنوں کو سجدۂ بے سر مرا مبارک ہو
وہ تیرا جلوۂ بے سمت پھر ہوا مشہود
نگاہ پھیر کے مجھ سے تجھے سکوں نہ ملا
تری نظر کی طرح عشق بھی نہیں محدود
وہی ہے میکشِ ناکام تیرا دیوانہ
رہا حرم سے جو محروم دیر سے مردود

بادۂ اہلِ ہوس میں نہ یقیں ہے نہ حضور
فکر اربابِ خرد میں ہے نہ مستی نہ سرور
کس کو سمجھاؤں ترے عشق کی دولت کیا ہے
مستی و کیفِ ابد، مایۂ ایمان و حضور
تجھ سے بھی دل کو زیادہ ہے تری یاد عزیز
دیکھ آکر مری ناکامیِ اُلفت کا سرور
بے نیازی غمِ اُلفت کی دکھاؤں تجھ کو
کہہ رہا ہے ترا جلوہ ابھی افسانۂ طور
اور اک راگ غمِ دل کا سناؤں تجھ کو
گونجتا ہے تری نظروں میں ابھی سازِ غرور
میرا معبود ہے گو تیرا تکبر بھی مگر
نہ خدا تجھ کو دکھائے کبھی اُلفت کا غرور
گرمیِ سوزِ محبت کے سوا کچھ بھی نہیں
بند کرلوں جو میں آنکھیں تو تجلی ہے نہ طور
کرکے اپنے سے الگ میں تجھے دیکھوں بھی تو کیا
اے نمودِ دو جہاں تو ہے مری آنکھ کا نور

جہت و فاصلہ سب گم ہیں رہِ اُلفت میں
کیا بتائے ترا طالب تجھے نزدیک کہ دور
کچھ نہیں. تیرے سوا یہ ترا مسلک لیکن
پھر بھی کچھ فاصلہ لازم ہے محبت میں ضرور
1941

بہت ملا وہ بہت مجھ سے بے نیاز رہا
مگر یہ دل نہ تباہی سے اپنی باز رہا
کچھ اس طرح تری اُلفت میں کاٹ دی میں نے
گناہگار ہوا اور نہ پاکباز رہا
پہونچ ہی جائے گا یہ ہاتھ تیری زلفوں تک
یونہی جنوں کا اگر سلسلہ دراز رہا
وہ اپنی ہر نگہ ناز پہ ہوئے نادم
کچھ اس ادا سے محبت پہ مجھ کو ناز رہا

خراماں خراماں پریشاں پریشاں
تصور ترا روح پہ چھا رہا ہے
نہ معلوم آخر ترے دل میں کیا ہے
مرا دل پریشاں ہوا جارہا ہے
زبانِ تخیل سے اُلفت کے نغمے
کوئی سن رہا ہے کوئی گا رہا ہے
وہ آئے وہ جھانکا وہ جھجکے وہ بھاگے
تصور تماشا بنا جارہا ہے
کوئی شکل حیکش سے ملنے کی للہ
زمانہ ہوا پر اُڑا جارہا ہے
1940

بیٹھے ہیں گیسوؤں کو پریشاں کیے ہوئے
میرے جنوں کا حسن کا عنواں کیے ہوئے

جی چاہتا ہے کیجیے برہم مزاجِ حُسن
مدّت ہوئی ہے اُن کو نمایاں کیے ہوئے
جرأت تو میری دیکھ کہ ہوں تیرے سامنے
ہستی سے اپنی تجھ کو نمایاں کیے ہوئے
رکھتا ہوں سو معاملے تجھ سے بہ فیضِ دل
اپنی نظر سے بھی تجھے پنہاں کیے ہوئے
ہے وہ نظر تواضعِ اُلفت سے مطمئن
مہماں کو نذرِ شوخیٔ مژگاں کیے ہوئے
یارب پھر ایک بار فقیروں پہ مرحمت
مدّت ہوئی زیارتِ انساں کیے ہوئے
گویا انھیں کی یاد میں ہے میکش خراب
خود اپنے کفرِ عشق کو ایماں کیے ہوئے

خود ہی میں ساقی تھا خود میکش تھا خود ہی جام تھا
ہائے وہ دن جب مرے جلوے تھے تیرا بام تھا
میری کم ظرفی کہ تیرے سامنے رویا کیا
رنج میں بھی مسکرایا تو یہ تیرا کام تھا
دل کی بربادی میں کچھ لذّت ہی تھی ورنہ مجھے
آپ سے کیا کام ہوتا آپ سے کیا کام تھا
تیری خاموشی نے خود داری سکھائی ہے مجھے
ورنہ دردِ عشق سر سے پاؤں تک پیغام تھا
آج وہ انداز بھی تیرا قیامت ہے مجھے
کل جو تھا دل کی مسرت روح کا آرام تھا

کس طرح اُس گھر کو خالی دیکھیے جس گھر میں کل
آپ تھے اور آپ کا میکش تھا دورِ جام تھا

کر کے خراب عشق کو کیا کوئی کام اور ہے
بعد نگاہِ مست کے لغزشِ گام اور ہے
حشر و بہشت میں بھی خیر وقفہ چند آہ اور
ورنہ ابھی تو عشق کو ذوقِ خرام اور ہے
ناز و نیاز سے الگ ہجر و وصال سے بلند
ان کی حریم خاص میں میرا مقام اور ہے
قہر نہ کر تمام ابھی بات ہے ناتمام ابھی
بعد سلام شوق کے عذرِ سلام اور ہے
اے کہ تری نگاہ نے دل کو مرے کیا خراب
آ کہ دلِ خراب میں اک ترا نام اور ہے
کھویئے مدّعا کہاں پایئے مدّعا کہاں
شانِ نگاہ اور ہے طرزِ کلام اور ہے
زاہدِ پاکباز ہوں میکش مے نواز ہوں
عشق کے ہر مقام میں میرا پیام اور ہے

کہاں فرصت ہے اہلِ عشق کو سوزِ محبت سے
جو ہوتا بھی تو وہ بے مہر کس کا آشنا ہوتا
خوشی تو مٹ چکی لیکن نگاہِ لطف نے تیری
دیا تھا دل کو وہ دھوکا کہ غم بھی مٹ گیا ہوتا

تو اگرچہ جاں ہے میری مرا دل ہے خام پھر بھی
کہ جو میں نے تجھ پہ ڈالی وہ نظر تھی عاشقانہ
مرے فقر پر ہے شاید نظرِ امیر خوباں
کہ دیا ہے میرے دل کو یہ فراغ خسروانہ
ترا ذکر و فکرِ قلبی ترا حج و طوفِ کعبہ
نہ مٹے دوئی تو سب کچھ رہ و رسم مشرکانہ
1938

وہ چند لمحے جو گزرے ہیں تیری خدمت میں
نہ ہوتے وہ بھی تو اس زندگی کا کیا کرتے
ہمیں تو مرکے بھی رہنا ہے یاد میں تیری
نہ تیری یاد میں جیتے تو اور کیا کرتے
مگر کہ زیست کا مقصد تھا آسرا تیرا
کہ زیست ختم ہوئی تیرا آسرا کرتے
تو خود ہی جانِ تمنا ہے آرزو کی بہار
ترے نثار تمنا بھی تجھ سے کیا کرتے
میں جان لیتا مجھی میں نہیں ہے جرأتِ عرض
وہ ایک بار نظر ہی کو آشنا کرتے

صبح کا جس طرح ہوتا ہے تصوّر شام سے
یونہی ہم پہچانے جاتے ہیں تمھارے نام سے

چاک کر ڈالا گریباں اپنا صبحِ حشر نے
میں نے تیرا ذکر چھیڑا تھا چراغِ شام سے
ہم نہیں پیتے ہیں اے ساقی مگر ہاں اس طرح
تیرے ہاتھوں سے تیرے پہلو میں تیری جام سے

سب کہاں کچھ ان کے جلووں میں نمایاں ہوگئیں
کتنی شکلیں تھیں محبت کی جو ارماں ہوگئیں
طور و موسیٰ پر گریں تھیں جو وہ مبہم بجلیاں
ڈھل کے سانچے میں تری صورت کے انساں ہوگئیں
تیرا بندہ ہوں مرا مسلک ہے ترکِ اختیار
تیرے کہنے سے جو رسمیں لیں وہ ایماں ہوگئیں

کہہ کے ہم تیری داستاں دل سے
ہوگئے آپ اپنے قاتل سے
جیسے دُنیا سے نوجواں کوئی
یوں اُٹھے ہم تمھاری محفل سے
ہوگئے خاک شمع و پروانہ
کون اُٹھتا ہے ان کی محفل سے

جبیں پہ اُن کی یہ بیندی کا داغ کیا کہیے
ہے آفتاب کی زینت چراغ کیا کہیے
ہر اک ادا تری قاتل ہے سارے عالم کی
کہاں لگائیے اپنا سراغ کیا کہیے

محال جان رہا ہوں ترا حصول مگر
ہے تیرے عشق سے دل باغ باغ کیا کہیے
پڑے گی کس پہ کہ تجھ پر ہی خود نہیں پڑتی
تری نگاہ کا کافر دماغ کیا کہیے
تری نگاہ کے مدہوش تیرے میکش سے
حدیثِ جام ولبِ جوئے باغ کیا کہیے

محفلِ عالم نمودِ خلوتِ یک جلوہ ہے
جلوۂ کثرت ظہورِ کثرتِ یک جلوہ ہے
ہے انھیں آرائشوں میں پاسِ ذوقِ ہر نظر
اہتمامِ جلوہ میں کب فرصتِ یک جلوہ ہے
بے خودی میں واں اُٹھاتے ہیں نقابِ ہر جہت
یاں مجھے طور خودی پر حسرتِ یک جلوہ ہے
ذوقِ بے تابی کو ہردم زخمِ تازہ چاہیے
میرے نظارے کو عذرِ الفتِ یک جلوہ ہے
عشق نے دی ہے تجھے عالم میں تکلیفِ ظہور
گلشنِ صد جلوہ فیضِ نکہتِ یک جلوہ ہے
کاش محشر میں سلامِ طالبِ دیدار لیں
ورنہ دُنیا تو ظہورِ نیتِ یک جلوہ ہے
اُن کی خلوت تک کہاں پہونچا نیازِ عاشقی
سجدۂ صد عمر الفت طاعتِ یک جلوہ ہے
التجائے عشق کا پردہ اگر حائل نہ ہو
خود نمائی کو تری کب جرأتِ یک جلوہ ہے

عشق کی فطرت تجلی ساز ہے لیکن مگر
عشق کی دنیا متاعِ حسرتِ یک جلوہ ہے

کیوں آج ناگوار ہے دل کو سکونِ درد
اے عشق کیا اصولِ طبیعت بدل گئے
دیکھا یہ اس نے آج مجھے کس نگاہ سے
اُمید ویاس ایک ہی ساغر میں ڈھل گئے
احساسِ ذوقِ دید بھی غفلت ہی تھا مگر
لی ہم نے ایک سانس کہ وہ رُخ بدل گئے
ساقی یہ لغزشیں ہی تو ہیں حاصلِ حیات
ہاں ایک جام اور کہ ہم پھر سنبھل گئے
افتادِ طبعِ اہلِ محبت نہ پوچھیے
وہ مُسکرائے بھی تو یہاں جی دہل گئے

وہ ستم دوست بنا دوست کسی کا نہ بنے
کیا بنے بات جہاں دل سے تمنا نہ بنے
مجھ میں بھی اک ترا جلوہ ہے وہ کافر جلوہ
دیکھ لے تو بھی جو اے شمع تو پروانہ بنے
دل ہے اور آپ کے وعدے کا یقین کیا کہیے
کوئی اتنا نہ مٹائے کوئی اتنا نہ بنے
تیرے وعدے نے عجب سحر کیا ہے مجھ پر
تو بھی خود یاد دلائے تو تقاضا نہ بنے

آدمی ہوش میں اپنے جو رہے اے میکش
گھٹ کے مرجائے طلب گار کسی کا نہ بنے

نگاہوں سے تمھاری گرچہ تھیں سب شورشیں دل کی
جو ہم اُٹھے تو وہ تم تھے نہ وہ گرمی تھی محفل کی
تری شانِ کریمی بھی تھی خود اظہار کی طالب
یہی تیری طلب تو ہے حقیقت دست سائل کی
ہوا ثابت کہ اپنی جستجو میں تھی پریشانی
حقیقت نے تری تصویر جب میرے مقابل کی
ذرا اے اہلِ دل انصاف کیا کوئی نقاب اُلٹے
وہ نازک اور نازک تر نظر اور ساری محفل کی
ترے طرزِ بیاں نے رُوح پھونکی بزم میں لیکن
ترے خاموش رہنے سے بھی کیا گرمی تھی محفل کی
نہ جانے کتنے طوفاں موجزن ہیں ذرّے ذرّے میں
تجھے اے موجِ دریا کیا خبر تسکین ساحل کی
مجھے کیا کارواں سے آپ اپنا کارواں ہوں میں
وہی منزل ہوئی میکش جہاں بھی میں نے منزل کی

آجا مرے جنوں کو تماشا کیے بغیر
اُلفت کو بے نیاز تمنا کیے بغیر
کیا مطمئن ہیں وعدۂ فردا کے بعد وہ
کیوں کر بنے گی اُن سے تقاضا کیے بغیر

تم آگئے تو اور خلش دل کی بڑھ گئی
اچھے تھے ہم خلش کا مداوا کیے بغیر
ہے تیری ہر نظر کو تمنا سے دشمنی
بنتی نہیں ہے پھر بھی تمنا کیے بغیر
اک ذرّہ فیضِ حسن سے خالی نہ تھا مگر
مانا نہ عشق ذرّے کو صحرا کیے بغیر
کیا شے ہوں میں کہ مجھ پہ پڑی جو تری نظر
چھوڑا نہ میں نے اُس کو تمنا کیے بغیر

مٹایا جا رہا ہوں ہر ادا سے اور نہیں خفا
وہیں بنتا ہے عالم خاک پڑتی ہے جہاں میری

صنعت نہ ہوگی تاہم کیا چیز ہوگئے تم
ہر شخص سے تواضع ہر بات پر تبسم
دیکھو نہ میرے دل کی تصویرِ پائمالی
اپنے سے خود نہ نفرت کرنے لگو کہیں تم
جس دن سے تیرے دل تک پہونچیں مری نگاہیں
یکساں ہے مجھ کو تیری خاموشی وتکلم
ہے کس مقام پر اب الفت خدا ہی جانے
ہیں وہ بھی آج چپ چپ بیٹھے ہیں ہم بھی گم سم
میں سوچ میں تھا چھوڑوں کس طرح دو جہاں کو
اچھا ہوا کہ مجھ کو ایسے میں مل گئے تم

میکش سا آدمی اور اُلفت کی سخت راہیں
ہر گام پر ہے لغزش ہرگام پر تصادم

اے دل تجھے نہ آیا اب بھی قرار دیکھا
آج اُس نے مجھ کو دیکھا اور بار بار دیکھا
اُڑتی ہوئی نظر کی بہکی ہوئی نظر کی
فرزانہ وار دیکھا مستانہ وار دیکھا
پہلے مجھے جتا کر پھیری نگاہ اُس نے
پھر مڑکے میری جانب بے اختیار دیکھا
چھپنا ہی مصلحت تھا چھپ کر بھی آزمایا
اپنی نظر کو اس نے جب بے قرار دیکھا
کر ڈالا اک نظر سے برباد مجھ کو آخر
اپنے کو جب کرم پر بے اختیار دیکھا
مایوس ہو کے آخر پھیری تھیں جس سے نظریں
پھر میں نے آج اُسی کو انجام کار دیکھا
نکلی نہ دل سے خواہش کچھ دیکھنے کی گرچہ
رنجِ خزاں اٹھایا عیشِ بہار دیکھا
ہوگا کوئی شہید مستی بھی ورنہ ہم نے
آنکھوں میں تیری جب بھی دیکھا خمار دیکھا
ایسے غیور کا راز اے دوست کون جانے
جس کو خموش پایا یا اشکبار دیکھا
اب میں ہی میں ہوں میکش وہ دن گئے کہ میں نے
خود کو خراب کرکے ان کو سنوار دیکھا

ہوئے تم بھی اسیرِ آرزو کیا
نہیں تو میرے دل کی جستجو کیا
زمانے بھر کی تو ہی آرزو ہے
ترے آگے کسی کی آبرو کیا

نہ مل اگر نہیں ملتا ہے جستجو لے لے
نہ دے جو کچھ نہیں دیتا ہے آرزو لے لے
ذرا سرک کے چلا آ نگاہ کے آگے
سنبھال قرب کو اپنے رگِ گلو لے لے
اگر مری ہے یہ ہستی تو اختیار بھی دے
نہیں تو خیر سے ہستی بھی اپنی تو لے لے
مجھے فقط مری ہستی کی رفعتیں دے دے
خطا معاف خود اپنے کو مجھ سے تو لے لے
نہ دے سکے جو اسے تو لطافتیں اپنی
تو آ کے ہستی میکش سے رنگ و بو لے لے
1936

اُن کے اقرارِ وفا پر سرخوشی اچھی رہی
کچھ سہی یہ چار دن کی چاندنی اچھی رہی
آبرو کم ظرفیِ شکوہ کی رکھ لی عذر نے
خود گلے سے لگ گئے یہ ناخوشی اچھی رہی

بے دلی سے تم رہے مجبورِ جان و دل تو کیا
اس فدائی سے تو اپنی بندگی اچھی رہی

تو نمودِ حُسن کا پابند میں آزادِ عشق
تیری خود داری سے میری بے خودی اچھی رہی

تجھے بہت طعنے ہوس کے اہلِ دل کی زیست پر
اے تری قدرت کہ مرگِ عاشقی اچھی رہی

کھا گئے وہ بھی فریب آرزو میری طرح
آرزوئے دل پہ اتنی برہمی اچھی رہی

دیکھتے ہیں بزم میں ہر ایک کو میرے سوا
دوستی سے آپ کی بے گانگی اچھی رہی

یوں تو تھی ہر قول میں میکش کے لذت درد کی
بات جو دل کو لگی ان کے وہی اچھی رہی

تیری محفل سے کچھ اس حال میں ہم آتے ہیں
جیسے مقتل سے شہیدوں کے علم آتے ہیں

تیری نظروں میں تو کچھ سحر ہے ظالم ورنہ
اپنے قابو میں بھی مشکل ہی سے ہم آتے ہیں

سن کے رہ جاتے ہیں ہم دیکھ کے جب لوگ تمھیں
کہتے ہیں دیکھیے وہ اہلِ کرم آتے ہیں

ہم بھی بیٹھے ہیں خفا جان سے اے جرأتِ شوق
ہاتھ میں وہ بھی لیے تیغِ دو دم آتے ہیں

گھر مرا کعبہ ہے یا مجلسِ ماتم میکش
ناز آتے ہیں اب ان کو نہ ستم آتے ہیں

تو گزر جائے تغافل کوش میں دیکھا کروں
ٹھہر اے موجِ رواں تمکین ساحل کو بھی دیکھ
کہہ چکا مجھکو بُرا میرے تحمل کی بھی سن
کر چکا اپنی نمائش اب مرے دل کو بھی دیکھ

تم جو کہنا چاہتے ہو اور کہہ سکتے نہیں
آج کچھ ایسی ہی باتیں کر رہے ہیں دل سے ہم
پوچھتا ہے کون گر آئیں نہ تیری بزم میں
روکتا ہے کون گر اٹھیں تری محفل سے ہم
اللہ اللہ اک نظر میں آپ کی یہ انقلاب
کہہ رہے ہیں حالِ فرقت کس سکونِ دل سے ہم
ان کے آتے ہی جنوں نے رُخِ گریباں کا کیا
ورنہ اک مدت سے تھے بیٹھے ہوئے غافل سے ہم

چھا گیا عالم پہ تیرا رنگ و بو میری طرح
ہوگیا سارا زمانہ تو ہی تو میری طرح
تھا بہت ممکن کہ مجھ میں دیکھتے اپنا جمال
آپ بھی کرتے جو اپنی جستجو میری طرح

عجیب طرح محبت میں انقلاب ہوا
نگاہِ شوق ہوئی شوق اضطراب ہوا

ترے شباب نے یوں دی مری نگاہ کی داد
ستارہ چاند ہوا چاند آفتاب ہوا

حُسن کی طرح اگر عشق نمایاں ہوتا
جتنا نازاں ہے تو اتنا ہی پشیماں ہوتا
عشق ممتاز ہوس سے کسی عنواں ہوتا
کاش دشمن نہ مری طرح پشیماں ہوتا
کیا ہے گر میرے جنوں میں ہے نمائش تیری
تیرے جلووں سے جنوں میرا نمایاں ہوتا
لے گئی دشت میں وحشت نے یہ احسان کیا
ورنہ ہم رہتے تو گھر اور بیاباں ہوتا
نہ مرے ہم یہ تری آبرو رکھ لی ہم نے
تیرے بیمار پہ کیوں موت کا احساں ہوتا
1935

سنجیدگی میں تیری کھویا گیا تبسم
پُر فن تری خموشی سادہ مرا تبسم
وہ میری التجا سے پھیری ہوئی نگاہیں
وہ نازکی لب سے چھلکا ہوا تبسم
اس حسن کی ادا کو کیا فتح عشق سمجھوں
گھٹتی ہوئی نگاہیں بڑھتا ہوا تبسم
محفل میں سب کے دعوے تصدیق ہو رہے ہیں
اُڑتی ہوئی نگاہیں چلتا ہوا تبسم

رنگِ شفق میں جیسے ڈوبا ہوا ہو دریا
وہ ان پہ سر سے پا تک چھایا ہوا تبسم
وہ ان کا عزمِ محفل وحدت میں عشقِ کثرت
آئینے کے مقابل جھجکا ہوا تبسم
افسردگی میں دل کی کھویا ہوا ہوں میکش
ورنہ خیال میں ہیں بے انتہا تبسم

شوق کے دفتر دلوں میں رہ گئے
گرچہ عاشق داستانیں کہہ گئے
دل میں خود اُن کے بھی چبھ کر رہ گئے
وہ نظر کے تیر جو ہم سہہ گئے
مہربانی آپ کی بارش بخیر
وقت کی موجوں میں عالم بہہ گئے
تھا تری نظروں میں وہ جادو کہ ہم
جو نہ کہنا چاہتے تھے کہہ گئے
تھی جنوں آمیز اپنی گفتگو
بات مطلب کی بھی لیکن کہہ گئے
نزع تک دل اس کو دہرایا کیا
اک تبسم میں وہ کیا کچھ کہہ گئے
آج وہ محفل میں میکش کی طرح
کچھ نہ بولے اور سب کچھ کہہ گئے

مرتب کر رہا ہوں داستان اُن کی جوانی کی
سنبھل جانا! بیانِ لغزشِ مستانہ ہوتا ہے
چھلک جاتا ہے جامِ ضبط وسعتِ شوق میں آکر
ترے انکار کا عالم بھی کیا مستانہ ہوتا ہے
کہیں ہوتا ہے لاکھوں آدمی میں ایک دو عاقل
ہزاروں عاقلوں میں ایک دو دیوانہ ہوتا ہے

جلوہ اور وہ بھی تجھ سے کافر کا
چوٹ اور آہ وہ بھی دل کی چوٹ
کرکے بیدار دے کے دید کا ہوش
چھپ گئے مجھ سے لے کے میری اوٹ
اُن کے دامن پہ آنچ کیوں آئے
وحشت اپنا ہی پیرہن جو کھسوٹ
1934

خود اعترافِ معصیتِ رندانہ ہوگیا
میرا غرور سجدۂ شکرانہ ہوگیا
تو میرے اختیار سے باہر نہ آسکا
میں تیرے اعتماد پہ دیوانہ ہوگیا
کیا کچھ امید تھی تری نیچی نگاہ تک
اور تو نظر ملاتے ہی بیگانہ ہوگیا
کیا قہر ہوگئی ترے رازوں کی معرفت
میں انتہائے عقل سے دیوانہ ہوگیا

اللہ اس نگاہِ غضب کی لطافتیں
میرا مزاج اور ظریفانہ ہوگیا
روکا کیا جنونِ محبت کو واعظِ بزم
پھر آج ایک نعرۂ مستانہ ہوگیا
بیٹھا تھا جمع کرنے دلِ لخت لخت کو
ان کی نگاہِ ناز کا افسانہ ہوگیا
میری نگاہیں اُن کی نگاہوں سے جب ملیں
عالم تمام نغمہ مستانہ ہوگیا
وہ رندِ ہوش باختہ میکش کہیں جسے
آتے ہی جام ہاتھ میں فرزانہ ہوگیا

آئی جو نکہت خمِ گیسو صبا کے بعد
یاد آگئی کسی کی عنایت حیا کے بعد
دے دے تو ہی جواب خدا سے ہے گو سوال
تجھ پر لگی ہوئی ہیں نگاہیں دعا کے بعد
توفیقِ جرم اُس پہ یہ لذّت گناہ کی
بڑھتا گیا یقینِ کرم ہر خطا کے بعد
ملتا ہوا ہے میرے جنوں سے ترا مزاج
اللہ یہ بے رخی نگہ آشنا کے بعد
کی تھی سکونِ دل سے تری التجا مگر
کھویا سکونِ دل بھی تری التجا کے بعد
میکش کو قتل خنجرِ انکار سے نہ کر
وہ خود ہی منفعل ہے بہت التجا کے بعد

پاتے ہیں مدّعا کو غمِ مدّعا سے ہم
سرشار ہیں تمنّیٰ بے التجا سے ہم
اب جس پہ چاہیں رکھ دیں وہ الزامِ میکشی
ہے مست ہم سے ان کی ادا اور ادا سے ہم
بے گانگی نے تیری دیا ہوشِ غیریت
ثابت ہوئے ہیں کس ستمِ ناروا سے ہم
بیٹھے رہے وہ خونِ تمنا کیے ہوئے
دیکھا کیے انھیں نگہِ التجا سے ہم
تیرا شباب ہے غمِ اُلفت کی ابتدا
یعنی ہوئے شروع تری انتہا سے ہم
اب کس سے جا کے ان کی شکایت بیاں کریں
اُن سے بھی پہلے روٹھ چکے ہیں خدا سے ہم
آزاد ہے علائقِ رسم ورواج سے
میکش کو جانتے ہیں بہت ابتدا سے ہم

جستجو ترکِ سکوں ہے کیا سکوں کی جستجو
کیا سکوں کیا جستجو یہ بھی ہے تو وہ بھی ہے تو
ہے دلِ دیوانہ بے تابی کا خوگر ورنہ یاں
ہے تو ہی پردے کے اندر اور تو ہی روبرو
ایک آفت آرزو خود اک مصیبت آپ دل
ایک محشر خود ہے تو پھر دل میں تیری آرزو

تو کہاں ہے اے دلِ ویراں کے مقصودِ جمیل
دیر تیری آرزو ہے کعبہ تیری جستجو
ہے رخِ جبریل فق اس سے دلِ ابلیس شق
تو نے دیکھی ہی نہیں ہے عشق کی اللہ ہو
یہ غبار آلودہ سر ہے ان کے پائے ناز پر
دیکھ لی اے نخوتِ دُنیا ہماری آبرو
وصل وفرقت پھر خدا جانے ہم ہوں یا نہ ہوں
کر بھی لوں اک نالۂ آخر تمھارے روبرو
1933

انھیں پاتا ہوں جب خالی تقاضائے محبت سے
تو بھر لیتا ہوں جامِ عاشقی اپنی حقیقت سے
مری ناخود شناسی سے ضرورتِ خلق ہوتی ہے
جہاں آباد ہے میری ہی نامعلوم حاجت سے
تجھے اے خام ذوقِ خود نمائی بزم میں لایا
مگر آدابِ محفل کے نہ سیکھے تو نے خلوت سے
نہ کیجیے کاوشِ سوزِ دروں مت چھیڑیے دل کو
تصادم ہو نہ جائے آپ کا اپنی حقیقت سے
معاذ اللہ واعظ بیعت اور بیعت بھی میکش کی
حقیقت کی طلب اور ایسے آوارہ طبیعت سے

رحم کے قابل ہیں تیری ظلم پر مجبوریاں
صلح کرنے پر جنونِ عشق ہی مائل نہیں

کچھ مرے شوقِ شہادت کا مداوا چاہیے
یہ مجھے تسلیم ہے اے دوست تو قاتل نہیں

مخاطب کر کے کس عنواں سے دل کی داستاں کہیے
ستم کو تیرے کیا کہیے تجھے گر مہرباں کہیے
یہ خوابِ عشق ہے جو چاہیے تعبیر کر لیجے
زمیں کہیے زماں کہیے مکیں کہیے مکاں کہیے
جہاں معمور رشکِ غیر سے ہے دل کا کیا کہیے
فسانہ اس نگاہِ لطف کا جا کر کہاں کہیے
زہے جلوہ ترے رُخ کا زہے سوزش مرے دل کی
محبت کو عیاں کہیے محبت کو نہاں کہیے
بہت پوچھا ہے مجھ سے ان کی دزدیدہ نگاہوں نے
نشاطِ غم کو کیا کہیے جو دل کو رائیگاں کہیے
محبت کے بیاں پر دوست دشمن بن گئے میکشؔ
مقدر کہیے یا تقصیرِ اندازِ بیاں کہیے

سحر ہونے سے پہلے جان دی بیمارِ فرقت نے
فسانہ نا مکمل رہ گیا شامِ جدائی کا

خزاں نصیب ہوں پروردۂ بہار ہوں میں
گیا ہوا ترے وعدے کا اعتبار ہوں میں
زمانے بھر میں تمھیں تم ہو پھر بھی کیا کہیے
کوئی چمن نہ ملا جس کو وہ بہار ہوں میں

تو رازِ عشق ہے سارے جہاں کا راز ہے تو
جہانِ راز ہوں میں تیرا راز دار ہوں میں
وہ شانِ حُسن کہ پنہاں ہے آشکار میں تو
یہ زورِ عشق کہ پنہاں میں آشکار ہوں میں
ملا لے اپنی فراموشیوں میں یاد مری
سرورِ بادہ ہے تو تلخیٔ خمار ہوں میں
مرا فریب ہے کتنا وقیع اے غمِ دوست
ہر اک سمجھتا ہے میکشؔ کا راز دار ہوں میں

مجھے اُلفت میں اب غم کا گماں ہے
خدا میرے تمھارے درمیاں ہے
نہ اب مڑ کر بھی دیکھیں گے کسی کو
سلام اے عمر رخصت کارواں ہے

سازِ شادی بھی نہ ہو شورشِ ماتم بھی نہ ہو
بے خودی کا ہو وہ عالم کہ وہ عالم بھی نہ ہو
آبرو ہے دلِ مضطر کی خلش کے دم سے
یوں کرم کیجیے کہ احساسِ ستم کم بھی نہ ہو
دردِ دل تیرے تغافل سے فزوں ہے لیکن
یہ وہ کافر ہے ترے رحم سے جو کم بھی نہ ہو
اس ادا سے ہے ترا حسن یہاں جلوہ طراز
نہ رہے گر کوئی بے گانہ تو محرم بھی نہ ہو

غمِ عالم کو مرے وہم سے تعبیر نہ کر
تو ہی عالم ہو تو پھر کیا غمِ عالم بھی نہ ہو
جمع ضدین پہ اصرار ہے خود داری کو
کہہ بھی دوں حالتِ دل اور وہ برہم بھی نہ ہو
تیری ہم ذوقی کی عادت ہے مجھے بھی ورنہ
دل کے زخموں کے لیے خواہش مرہم بھی نہ ہو
تجھ سے اے ہمدمِ دیرینہ مگر کیا کہیے
غیرتِ عشق تو کہتی ہے کہ اب دم بھی نہ ہو
مرے ہونے سے نہیں خوش وہ مگر اے میکش
جب میں جانوں کہ نہ ہونے کا مرے غم بھی نہ ہو

مرے غم میں کیف بڑھا بھی دے یہ دو جام ہو بادہ ملا بھی دے
تری آنکھ میں بھی سرور ہے مری آنکھ میں بھی خمار ہے
تو ہی زیبِ خلوت و انجمن تو ہی نکہتِ گل و نسترن
ترا حسن بھی ہے چمن چمن مری آنکھ میں بھی بہار ہے
تمھیں آبرو کی حفاظتیں ہمیں بے سبب کی شکایتیں
نہ تمھارے دل کو سکون ہے نہ ہمارے دل کو قرار ہے

ہوں بے خودی میں قبلۂ اربابِ جستجو
کھویا میں جس جگہ اسے منزل بنا دیا
جو جلوہ صرف ہو نہ سکا تیرے حُسن میں
ناکامیوں نے اس کو مرا دل بنا دیا

وہ ترا عشق پہ احساں کرکے
خود ہی شرمندۂ احساں ہونا
1932

کیوں نگاہِ رحم کی تو نے دلِ ناکام پر
ایک منظر یاس کا تھا وہ بھی ویراں ہوگیا
کل تمنا پر تری صدقے کیے تھے دو جہاں
آج دل تیری تمنا پر پشیماں ہوگیا
اللہ اللہ کفرِ اُلفت کے یقیں کی وسعتیں
جو خیال آیا مرے دل میں وہ ایماں ہوگیا
بڑھ گئی خود داریِ سائل ترے انکار سے
خود ترا دستِ کرم اب میرا داماں ہوگیا

رازِ حُسن کا حامل ہوں شانِ حُسن پہ مائل ہوں
مجنوں ہوں ہر محمل کا محمل ہوں ہر لیلا کا
غم کے ہاتھوں تیرے لیے دل کی حالت کیا کہیے
دھوپ میں گرمی کی جیسے کوئی مسافر صحرا کا
ذوقِ ساحل کھو کر دیکھ طوفانوں سے لڑ کر دیکھ
موج کہاں طوفاں ہے کیا وہم ہی وہم ہے دریا کا
جتنے حسیں یہ سامنے ہیں عکس میرے آئینے ہیں
جو کچھ ہے سب جلوہ ہے اپنے ذوقِ تماشا کا

اپنی نظر پہ غور کر حسن چمن کی حد کہاں
تجزیۂ حواس کر تکملۂ بہار کیا

جس پہ نگاہ حال ہے صرف وہی جمال ہے
تہنیت خزاں جو کر تعزیت بہار کیا

بیکسی فراق میں ایک ہے موت وزندگی
موت پہ اختیار کب زیست کا اعتبار کیا

سوز دروں کہ حاصل زیست تھا رائیگاں ہوا
بعد فنا نمائش شمع سر مزار کیا

ہے احساسِ خودی سب کو کوئی مومن ہو یا کافر
چلا سب پر ترا جادو پڑھا سب نے ترا منتر

تخیل سب سے برگشتہ نگاہیں رزم ناسفتہ
خود اپنے سے بھی آشفتہ زہے شرم و خجے منظر

یہاں میں حیلہ جو دل سے زیادہ بات بے قابو
وہاں وہ مدعا فہم و سخن چیں و سخن پرور

ہے تو برگِ گل خوبی ضیائے شمع محبوبی
مگر کیا کوئی شے دیکھی ہے تو نے دل سے نازک تر

جفا میں مہر کے آئیں وفا کو جور سے تزئیں
شرارت شرم سے رنگیں حیا میں شوخیاں مضمر

دیا ہے مدتوں میں عشق نے وہ دل مجھے جو ہے
تری تنبیہ سے شاداں تری تسکین سے مضطر

مری رندی کا قشقہ ہے جبینِ زہد پر میکش
کہ ہو کر خاکِ میخانہ رہا میں عزت منبر

رکھ گئی سوز تمنا قلب یاس انگیز میں
تھی تبسم کی جو بجلی اس نگاہِ تیز میں

سونپ دیں کس نے مجھے دیوانگی ہائے طلب
ڈھونڈتا ہوں غم تمہاری بزم فرحت خیز میں

آئینہ لاؤں مگر کیا تم سے دیکھی جائے گی
خونِ الفت کی یہ زینت حسن سحر انگیز میں

اس طرح سے ہے سکوں میں میرے پنہاں اضطراب
جس طرح ہو مژۂ خوابیدہ بار تیز میں

پڑ رہا ہے عکس یہ چشمے کے اندر چاند کا
یا تصور تیرا میرے دیدۂ لبریز میں

زیست سے بے زار ہوں میکش میں لیکن کیا کہوں
کس بلا کا کیف ہے اس جامِ سم آمیز میں

غرور حُسن کو عکس نیاز عاشق سمجھے
زہے غفلت کہ ہم غفلت کو تیری آگہی سمجھے

ہماری بات کو جو آپ سمجھے ہم وہی سمجھے
مگر اس عاشقانہ مصلحت کو آپ بھی سمجھے

ترقی یافتہ صورت جہالت کی علم اپنا
جو کچھ سمجھے وہی دیکھا جو کچھ دیکھا وہی سمجھے

کچھ اس انداز سے پیدا ہوا اُلفت کا غم دل میں
کہ غم ہی اس کو کہہ سکتے تھے لیکن ہم خوشی سمجھے

انھیں جب رحم آتا ہے تو مجھ پر ظلم کرتے ہیں
نہ سمجھا کوئی فطرت عاشقی کی اک وہی سمجھے
حیا آگیں سکوتِ ناز تھا اظہار اُلفت پر
مگر مجبور تھی اُلفت کہ اس کو نا خوشی سمجھے
قدم اک اور آگے رکھ مقامِ ہوش سجدہ سے
خدائی کی وہ خواہش ہے جسے سب بندگی سمجھے
نہ سمجھا ہے نہ سمجھے گا زمانہ مجھ کو اے میکش
کیا ہے جس نے دیوانہ جو سمجھے تو وہی سمجھے

اے فتنہ ہر محفل اے محشر تنہائی
لے پھر ترا نام آیا لے پھر تری یاد آئی
یاں شوق کا ہنگامہ واں شرم کی تنہائی
واں سر نہ اُٹھا ان کا یاں جان پہ بن آئی
تیری نگہ اوّل دل کا نفس آخر
آغاز شناسائی انجامِ شکیبائی
جس طرح ترے لب پر عنوانِ بہار آیا
اس شان سے گلشن میں کس روز بہار آئی
تو راز کا جلوہ ہے میں راز ہوں جلوے کا
پیدا تری پنہائی پنہاں مری پیدائی
ہو تم نہ مخاطب وہ رُخ پھیر نہ لوں کیوں میں
جاتا نہ رہے دل سے پندارِ شناسائی
یوں ہے دلِ غمگیں میں احساس تمنا کا
جیسے تری محفل میں یادِ شب تنہائی

ظاہر ہو کہ باطن ہو میں تیرے سوا کیا ہوں
خلوت میں تجلی ہوں محفل میں تماشائی
پھر اُٹھے وہ گھبرا کر افسانۂ اُلفت سے
پھر بیٹھ گئے آخر لیتے ہوئے انگڑائی
اقرار سے اب کردے برباد تمنا کو
انکار کو سمجھا ہوں عنوانِ پذیرائی
جو عیب ہیں دُنیا کے ہیں میرے ہنر میکش
رندی و سیہ مستی بدنامی و رسوائی

ہماری یاد بہ تقریب ظلم آئی تو ہے
جگر کی ٹیس کسی کا پیام لائی تو ہے
ضرور پھر کوئی دیوانگی ہوئی مجھ سے
ہنسی کسی کے لبِ خشم گیں پہ آئی تو ہے
وہ دیکھ چھا گئی چہرے پہ آشنائی راز
مٹا کے تو نے تبسم نظر چرائی تو ہے
ہمیں بھی کرنا پڑی آج دل سے قطع نظر
یہ بے رُخی کی ادا آپ نے دکھائی تو ہے
وہ تیری خواہش پنہاں کہ زد مجھی پہ پڑی ہے
بچا کے مجھ کو بہ ظاہر نظر اٹھائی تو ہے
دکھا بھی دوں انھیں مر کر یہ جی میں ہے میکش
اگرچہ یہ بھی محبت میں بے وفائی تو ہے

1931

یہیں اک آسماں بھی ہے زمیں پہ
قدم رکھیے مری خاکِ جبیں پہ
رکھی ہے الفتِ بے مدعا نے
بنائے آرزو ان کی نہیں پہ
ہے خونِ تمکینِ شوقِ سادہ دل کا
تری چشمِ تبسم آفریں پہ
گماں ہونے لگا اے جبرِ وحشت
مرے دامن کا اُن کی آستیں پہ
تمھارا در ہے ہم بھی جانتے ہیں
مگر اب آن بیٹھے ہم یہیں پہ

جس کو پورا نہ آپ کھینچ سکے
رہ گیا ہے وہ تیر دم ہو کر
وہ خوشی جس پہ تھا مدارِ حیات
دل میں آتی ہے آج غم ہو کر

قتل کرکے بھی گماں کرتا ہے تو بسمل مجھے
اپنی صورت سے ملا کر دیکھ اب قاتل مجھے
مجھ کو دنیا نے بہت پایا مگر کھویا ہوا
تھی وہیں خلوت جہاں یاد آئی وہ محفل مجھے
میں دلیلِ مدعا ہوں میں جوابِ ہر دعا
حاصلِ کون و مکاں ہوں کچھ نہیں حاصل مجھے

مجھ سے منزل کا تعین مجھ سے منزل کا وجود
چاہے گر اپنے کو پانا ڈھونڈھ لے منزل مجھے
لے کے رُخ پر سوزِ دل میں جان کر غافل رہا
دیر تک دیکھا کیا وہ جان کر غافل مجھے
تیرے جلوے کی عنایت یا مرے دل کا قصور
آج ہر ذرّہ نظر آیا جوابِ دل مجھے
مرحبا میکش تری دیوانگی مقبول ہے
بوئے جاں آتی ہے تجھ میں سے بہ ربِ دل مجھے

کہیں کیوں کر فریبِ کارِ ہستی
بہ مجبوری یہاں مختار ہیں ہم

کتنے لمحے شاد رہے گا دل اپنا کیا شاد کرو
جس نے چھینی راحتِ دل بہتر ہے اُسی کو یاد کرو
وہ تھے تو اک اک لمحے میں تھے ان سے ہزاروں کام مجھے
اب دل کو فرصت ہی فرصت ہے چاہے جتنا یاد کرو

کہاں کا قصد ہے اے مستِ جام بے خبری
دلوں کو نرم نگاہوں کو آشنا کرکے
اگرچہ عشق بھی خاموش التجا ہی ہے
مگر ذلیل ہوئے تم سے التجا کرکے
غلط نصیحتِ تمکیں کہ عارضی ہی سہی
سکون ہو تو گیا عرضِ مدّعا کرکے

یوں تری دشمنی ہے دل کو عزیز
جیسے ہوتی ہے آگ جاڑوں میں
میں ہوں یوں زیبِ خانہ ویرانی
ہو شفق جس طرح پہاڑوں میں
1930

قید[1] واطلاق کا نقاب اُٹھا
بے حجابی اُٹھا حجاب اُٹھا
کس ادا سے ترا حجاب اُٹھا
فرقِ تسکین واضطراب اُٹھا
تھی فنا ہی مرا مقام مگر
نہ رہے تم بھی جب حجاب اُٹھا
میں سہی صرفِ یک نظارۂ حسن
اور جو پہلے مرا نقاب اُٹھا
حق وباطل کا امتیاز یہ ہے
امتیازات کے حجاب اُٹھا
خاکساری بھی ہے ریاکاری
ہستیِ غیر کا نقاب اُٹھا
سب پہ افسردگی ہوئی طاری
بزم سے میکش شراب اُٹھا

---

1. یہاں سے میکدہ کی غزلوں کا انتخاب ہے

کیا قیامت تھا وہ جلوہ تری رعنائی کا
تجھ سے دیکھا نہ گیا حال تماشائی کا
تذکرہ فرض ہی کیا ہے تری رعنائی کا
سچ تو یہ ہے کہ مجھے شوق ہے رسوائی کا
تو ہے اور ننگ تجھے میری پرستاری سے
میں ہوں اور فخر مجھے تیری شناسائی کا
حیرتِ جلوہ سے چھایا ہے اندھیرا ہر سو
تیرے جلووں میں ہے عالم شب تنہائی کا
مجھ کو غیرت کہ تمھیں دیکھ رہی ہے دُنیا
مطمئن تم کہ تماشا ہے یہ سودائی کا
دے نگاہوں کو نہ تکلیف تماشائے جہاں
راز ہے تیری نظر میں مری رسوائی کا
جس سے بیدار ہوا تم میں حیا کا جذبہ
وہی عالم تھا مرے شوق کی رعنائی کا
مطمئن ہوگئے کچھ دیکھ کے آئینے میں تم
تمھیں اندازہ کہاں عشق کی گہرائی کا
محو ہے اپنی پرستش میں وہ کافر میکش
معتبر آج نہیں زعم شناسائی کا

شب فرقت کی تاریکی میں شامل ہے غبار اپنا
اسی صحرا میں کھویا عشق نے عہد بہار اپنا

مٹا گلشن تو اٹھ کر خاکِ گل سے ہم کہاں جاتے
جہاں گلشن تھا پہلے اب وہیں پر ہے مزار اپنا
ترے جلووں میں گم ہوں یا تری فرقت میں مٹ جائیں
یہ ہم سمجھے ہوئے ہیں ہے فنا انجامِ کار اپنا
ہجومِ یاس میں بیگانگی کا شکوہ کس سے ہو
نہ ہم اپنے نہ دل اپنا نہ جاں اپنی نہ یار اپنا
کہاں اب وہ سرورِ دورِ اوّل بزمِ ہستی میں
جسے کہتے ہیں دُنیا ہے وہ اے میکشؔ خمار اپنا

چھا گیا دل پہ اضطراب کا رنگ
ہے مگر یہ ترے شباب کا رنگ
عشق ہی ہے نہ نقابِ جمال
کہہ رہا ہے تری نقاب کا رنگ
شوق میں یاں یہ شانِ تمکیں ہے
واں تغافل میں اضطراب کا رنگ
یاں جوابوں میں ہے سوال کا طور
واں سوالوں میں ہے جواب کا رنگ
یاں نہیں جز ظہورِ یک جلوہ
دیکھ ہر شے میں آفتاب کا رنگ
دوست سب کا ہے اور کسی کا نہیں
دیکھنا میکشِ خراب کا رنگ

دل پہ تو حقیقتِ حُسنِ مجاز ہے
آئینہ عکسِ حیرتِ آئینہ ساز ہے
اے دوست ہے حریفِ ادا خوئے غم مجھے
ہر غمزہ ورنہ قیمتِ عمرِ دراز ہے
اے ذوقِ جلوہ چاہیے کچھ امتیاز بھی
کیوں ہر نگاہ پہ درِ آئینہ باز ہے
یہ احتساب ضامنِ عصمت ہے خود مگر
میں پاکبازیوں ہوں کہ تو پاکباز ہے
میں شاد ہوں کہ صرفِ یک انداز جلوہ ہوں
میرا جنوں نمائشِ زلفِ دراز ہے
ہوں طالبِ بقا میں بہ عنوانِ ہر جنوں
ہستی کا ذوقِ سوزِ تمنا کا راز ہے

اعتبارِ منزل کیا ذوقِ جستجو ہی ہے
کامیابیِ دل کیا کیفِ آرزو ہی ہے
ترکِ جستجو کرکے دل کا مدعا پایا
ترکِ جستجو لیکن فیضِ جستجو ہی ہے
آبرو جسے کہیے کچھ نہیں بجز پندار
ہاں شکستِ ہر پندار اپنی آبرو ہی ہے
تو حقیقتِ عالم وہم غیرتِ باطل
بلکہ وہمِ باطل بھی حق تو یہ ہے تو ہی ہے

زلفِ مشکبو کا غم دل کو کیوں کرے برہم
دل کو جو کرے برہم زلفِ مشکبو ہی ہے
جس جگہ نظر ٹھہرے وہ حجاب ہے اُس کا
دے نظر کو آزادی پھر وہ روبرو ہی ہے
یہ فریبِ تسکیں ہے ترکِ آرزو معلوم
ترکِ آرزو سیکش یہ بھی آرزو ہی ہے

خدا جانے دل کو میرے کیا ہوا ہے
تمھیں سے خفا ہے تمھیں پر فدا ہے
تغافل ہی انجام سے اپنے بہتر
تری بے رُخی سے مری ابتدا ہے
ہیں خود معنیٔ حسن ہوں اے ستمگر
مگر کچھ جُدائی میں تیری مزا ہے
مرا دل ہے مرکز تمھارے ستم کا
کسی پر کیا تم نے مجھ پر ہوا ہے
میں اس دورِ ہستی میں وہ دائرہ ہوں
کہ ہر انتہا پر مری ابتدا ہے
نہ کچھ کہہ سکا میں نہ سمجھے وہی کچھ
بہت دیر سوچا کہ کیا مدّعا ہے
مجھے اپنے ہونے کے ہیں لاکھ شکوے
کیا تم سے شکوہ یہ اپنا گلا ہے
ہے مردودِ دیر اور کعبے سے فارغ
نہ مومن نہ کافر یہ دل کیا بلا ہے

میں ہر فلسفے کی حقیقت ہوں میکش
میں جس میں نہیں فلسفہ ہی وہ کیا ہے

میں ہوں لازم اُلفت کو مجھکو لازم الفت ہے
میں ہوں اپنی ضرورت سے مجھ سے میری ضرورت ہے
بعد ہر اک ناکامی کے بڑھتی ہے اُمید مگر
پہلے تمھارا شکوہ تھا اب اپنی بھی شکایت ہے
تیرے ستم کا کیا شکوہ تیرے کرم کا کیا کہنا
جب بھی دل میں حسرت تھی اب بھی دل میں حسرت ہے
تم سے شکوہ کیا کیجیے کافر دل کو کیا کہیے
یا تم سے بھی نہ تھی تسکیں یا غم پر ہی قناعت ہے
بدلا ہے اے شکوۂ دل کیا معیار تمنا کا
ورنہ جیسی پہلے تھی اب بھی ان کی عنایت ہے
تجھ میں خوئے ستم ہے مگر دل کو کیوں ہے لذتِ غم
شاید میری طبیعت میں شامل تیری طبیعت ہے
یا غم میں بھی لذت تھی یا لذت میں بھی ہے غم
جس کی جفا بھی راحت تھی اُس کا تصور آفت ہے
یا وہ خود بھی میکش تھے یا اب میکش خود ہی نہیں
کس سے شروعِ اُلفت تھا کس پہ مآلِ اُلفت ہے

تمنا کی جو تیری تو تمنا تھی مجھے غم کی
مگر سازشِ تمنا سے تری نظروں نے کیا کم کی

نہیں موقوف کچھ ملنے نہ ملنے پر ترے ظالم
مرے دل سے نہ جائے گا یہ فطرت ہے ترے غم کی
تقاضا دردِ دل کا ہے کہ لے کر مجھ کو اُڑ جائے
جسے کہتے ہیں نالہ کوششِ ناکام ہے رم کی
تمھیں جب دیکھتا ہوں چاہتا ہے جی کہ مٹ جاؤں
خدا جانے یہ کیفیت مسرّت کی ہے یا غم کی
خلش خارِ تمنّا کی ہے وجہ زندگی مجھ کو
وفا کا کیا کروں شکوہ جفا بھی آپ نے کم کی
جو چمکی برق باراں میں جو تڑپی موجِ طوفاں میں
نظر میں پھر گئیں شانیں کسی کے حسنِ برہم کی
نہ چھیڑو سازِ عشرت اور تھوڑی دیر دم لے لو
نہ کر دے پست نغموں کو صدا میکش کے ماتم کی

فکر میں تو ہے کہ دل سے مرے غافل ہو جائے
دل کی کوشش کہ تری فکر میں شامل ہو جائے
دیکھنے پر ترے موقوف نہیں وحشتِ دل
تو نہ دیکھے تو یہ انداز بھی قاتل ہو جائے
ذوقِ بربادیٔ دل قیدیٔ پندار نہیں
تیری نظریں جسے لوٹیں وہ مرا دل ہو جائے
حیرتِ جلوہ محافظ ہے خود اے پردہ نشیں
تو چلا آئے تو یہ بزم ہی محمل ہو جائے
میں ہوں آزاد ہر اک رنگ سے میکش لیکن
دل کو سودا ہے کہ ہر رنگ میں شامل ہو جائے

ترے پردے کا شکوہ تجھ سے یہ بھی چھیڑ ہے ورنہ
سبب جو میرے مٹنے کا ہے وہ خود وجہ ہستی ہے
خراب شان استغنائے ساقی ہوں میں اے رندو
مجھے ساقی کو سجدہ بھی خلاف شان مستی ہے

رو کر بھی دل نہ ٹھہرا سو کر بھی غم نہ بھولا
کیا کر دیا یہ ظالم تو نے ہنسی ہنسی میں
رازِ الوہیت کو ہم جانتے ہیں لیکن
کچھ رفعتیں ہیں پنہاں آدابِ بندگی میں
ہم پا شکستِ گانِ اُلفت کا پوچھنا کیا
اٹھ کر تری گلی سے بیٹھے تری گلی میں
1929

تغافل سے فزوں ہے گو غمِ دل
ترحم سے ترے کم بھی نہ ہوگا
خوشی کی جستجو اے دوست غم ہے
خوشی کو بھول جا غم بھی نہ ہوگا
نہ ہونے کا ہے غم ہونے سے میرے
نہ ہوں گا میں تو یہ غم بھی نہ ہوگا
نہیں ہے تنگ دل بے مائگی سے
نہ ہوں کچھ تو کیا غم بھی نہ ہوگا

مٹے ہم گو جوانی پہ تمھاری
کوئی دن میں یہ عالم بھی نہ ہوگا

سودا نظر کا درد جگر کا کہاں گیا
یہ آفتیں بھی ساتھ گئیں میں جہاں گیا
ثابت ہوا یہ ہے ترا اندازِ مستقل
دل سے تری نگاہِ کرم کا گماں گیا
تنہائی فراق کی تفصیل کیا ضرور
جب تو گیا یہاں سے تو سارا جہاں گیا
اے یاسِ دشت ہی کو جو منزل بنایئے
اب یادِ کارواں ہے عبث کارواں گیا
پہچانتا ہے میری نظر کو ہر اک حسیں
مجھ پہ بلائیں ٹوٹ پڑیں میں جہاں گیا
وہ دن کہ جب تھی ہستی میکش سرورِ دل
وہ دور وہ زمانہ اب اے مہرباں گیا

جنازہ کشتۂ حسرت کا مرقد کے قریں آیا
نہیں آیا وہ کافر دیکھ لو اب بھی نہیں آیا
مقرر ہے بیخودی آنے کی اُس کے اور خلش سکر
تجھے کچھ ہوش ہے ہمدم وہ آیا یا نہیں آیا
نہیں ہے کیا یقیں تم کو مری بیتابیِ دل کا
مرے سینہ پہ رکھو ہاتھ کیوں اب تو یقیں آیا

یہ تم غیروں کی جانب دیکھ کر کیا مسکراتے ہو
ہمیں خود اعتبار وعدۂ فردا نہیں آیا

ہے سہل ممتنع مضمون ایسا ایسے عنواں پر
نہیں کی داستاں لکھی ہے میں نے آپ کی ہاں پر
پلک جھپکا کے کھولی آنکھ تو میں تھا نہ وہ عالم
مجھے دھوکا تمھارا ہوگیا عمر گریزاں پر
نہ کیجیے سرد کیف ابتدائے عشق کی گرمی
نظر بیگانہ وش مت ڈالیے عشاق نازاں پر
تمھیں جلنے سے پروانوں کے ہمدردی نہیں کچھ بھی
ترس آتا ہے کیا کیا گریہ شمع فروزاں پر
مرے دل اور نظر کا اپنی خود ہی فیصلہ کردے
تو کافر ہے مگر ہم چھوڑتے ہیں تیرے ایماں پر
ترے لطفِ گذشتہ کو بیاں کرتے ہیں وہ آنسو
جو جم کر آج پیکاں ہوگئے ہیں ہیں تیر مژگاں پر
قسم ساقی کی میں وہ رند عالم سوز ہوں میکش
کہ دنیا ایک دھبہ ہے مری ہمت کے داماں پر

نہ پوچھ کس لیے زخم جگر کو دیکھتے ہیں
اس آئینے میں کسی کی نظر کو دیکھتے ہیں
دمِ فنا تری پہلی نگاہ یاد آئی
ہم آج شام میں شانِ سحر کو دیکھتے ہیں

کچھ اس طرح ہوئیں تقسیم شوخیاں اُن کی
ہر ایک نے یہی سمجھا اِدھر کو دیکھتے ہیں
شکستِ دل کا یہاں اب خیال ہے کس کو
تری نگاہ میں کیفِ ظفر کو دیکھتے ہیں
کہاں کہاں ہے خلش درد کی معاذاللہ
کہاں کہاں تری ترچھی نظر کو دیکھتے ہیں
بہت بلند ہے میری نگاہ اے میکش
وہ اور ہوں گے جو عیب و ہنر کو دیکھتے ہیں

آ عاشقوں میں بیٹھ فنا عاشقوں سے سیکھ
یہ حسن بھی حجاب ہے اے بے حجابِ حسن
تجھ سے بھی کچھ فزوں ہے مرا دل سے واسطہ
تو انتخابِ عشق ہے دل انتخابِ حسن
وجدانِ ذوقِ جلوہ بغیر آئینہ نہیں
یعنی مری نگاہ میں دیکھو شبابِ حسن
ہم نے تجھے جو قبلہ الفت بنادیا
یہ حسن انتخاب ہے اے انتخابِ حسن

یوں اپنے وحشیوں کو نہ دیکھا کرے کوئی
کیوں رازِ التفات کو رسوا کرے کوئی
گم ہوگیا حقیقتِ وعدہ میں مدعا
کچھ یاد ہو تو اُن سے تقاضا کرے کوئی

افسانہ کامیابی دل کا نہ پوچھیے
اک قطرہ بھی اگر ہو تو دریا کرے کوئی
کیوں جلوہائے خاص سرِ بزم عام ہوں
کیوں میرے انتخاب کو رسوا کرے کوئی
دل کو نہیں حقیقتِ عالم سے کچھ غرض
مطلب یہ ہے خراب تماشا کرے کوئی
سب کچھ ہے اور کچھ نہیں میکش یہ حال ہے
میرا سا اعتبار تو پیدا کرے کوئی

قہر آلودہ نگاہیں تری کچھ غیر نہیں
آج بے زار ہے خود میری طبیعت مجھ سے
جانتے ہو کہ یہ ناراض ہے خود آپ سے بھی
ورنہ کیوں کرتے ہو تم میری شکایت مجھ سے
کثرتِ جلوہ سے ہر ذرّہ ہے آئینہ مرا
اب تو دیکھی نہیں جاتی مری صورت مجھ سے

وہ راز تھا سکونِ خلش راحتِ فراق
جو تھی تری نگاہِ مکرر لیے ہوئے
کیف خودی میں آج میں دُنیا پہ چھا گیا
ہاتھوں میں تیری زلفِ معنبر لیے ہوئے
یہ بیخودی شوق تو ہے اور شے مگر
رہتے ہیں ہم بھی آپ کو اکثر لیے ہوئے

رنگین بہت تھا عالم گم گشتگی کہ میں
چونکا تو دل میں فتنۂ محشر لیے ہوئے
تعبیر سوز غم سے میں کرتا نہیں مگر
ہے میری ایک شان تشکر لیے ہوئے

ہمیں اچھے نہیں لگتے تماشا دیکھنے والے
تجلی خود نہ کیوں بن جائیں جلوا دیکھنے والے
زہے اے حیرتِ جلوہ تجھی کو مرحبا کہیے
نہ جلوہ ہی رہا باقی نہ جلوا دیکھنے والے
یہی ہے اوّل و آخر مسرت کے فسانوں کا
سن اے میری مصیبت کا تماشا دیکھنے والے

نہ پوچھو حال کچھ حیرت کا برہم رنگِ محفل ہے
نہ وہ تم ہو نہ وہ جلوہ نہ وہ میں ہوں نہ وہ دل ہے
وہ کہتے ہیں محبت اور ہوس میں فرق ہی کیا ہے
نہ مرتا میں مگر یہ بات مر جانے کے قابل ہے
مرے دل کی خلش مجھ کو فنا ہونے نہیں دیتی
یہاں ورنہ ہر اک جلوہ مٹا دینے پہ مائل ہے

کچھ اور بات نہیں تو عبث حجاب میں ہے
خراب ہونے کی عادت دلِ خراب میں ہے

تو لا جواب سہی دل بھی لا جواب ہی ہے
تو انتخاب سہی دل بھی انتخاب میں ہے
بتوں کا عشق ہے کفارۂ گنہ واعظ
شمار اس کا گنہ میں نہیں عذاب میں ہے
برائی کچھ مری تقدیر ہی میں ہے ورنہ
وہی جنوں میں ہے جو آپ کے شباب میں ہے
خدا ہی بیکسی دل کی آبرو رکھے
شباب تجھ پہ ہے تو عالم شباب میں ہے

لو ختم ہوگئے ہم پالیں سے دوست سر کے
طے ہوگئے قضیے دم بھر میں عمر بھر کے
پوچھو نہ حال دل کا آتا ہے یاد کیا کیا
تازہ ہیں ہر خوشی میں سب داغ عمر بھر کے
ہوش آگیا مکرر بس کر عتاب بس کر
پھر اک نگاہ ہنس کر صدقے تری نظر کے
وہ پچھلی داستانیں کچھ کہہ تو یاد آئیں
ہمدم وہ دن وہ راتیں منظر تھے رہگذر کے
سیکش کے دم سے تازہ اگلی شرافتیں ہیں
اب آدمی کہاں ہیں اس دل کے اس نظر کے

چراغ طور کیا ہے گل چراغ طور ہو جائے
وہ کیا جلوہ ہے جو پابند سمت و نور ہو جائے

مری گم گشتگی منزل ہے منزل کس کو کہتے ہیں
خیال آجائے منزل کا تو منزل دُور ہو جائے
مٹاتا ہے مجھے گو تیرا اندازِ ستم لیکن
قیامت وہ ہے جب تو رحم پر مجبور ہو جائے
کشاکش وصل و فرقت کی ہے اپنے زعمِ باطل سے
تمھیں تم ہو جو میکش درمیاں سے دُور ہو جائے

تم ہو یا موت کی دعا اُس نے
جس کو جینے کا آسرا سمجھے
سادگی ابتدائے اُلفت کی
شوخیوں کو تری حیا سمجھے
گریہ ناتمام عیب نہیں
آپ ہنسنے کو میرے کیا سمجھے

میں کچھ سمجھوں یا کچھ بھی نہیں، ہشیار ہوں یا غافل میں ہوں
راہی میں ہوں رہزن میں ہوں جادہ میں ہوں منزل میں ہوں
یہ معرکۂ حسن و الفت سرخی ہے مرے افسانے کی
مجنوں میں ہوں صحرا میں ہوں لیلا میں ہوں محمل میں ہوں
ہوتے ہیں عطا نسبت سے مری ہر شے کو یہاں القاب وجود
دریا میں ہوں کشتی میں ہوں طوفاں میں ہوں ساحل میں ہوں
رخسارۂ گل کا غازہ ہوں غنچوں کے دلوں کی اُمیدیں
اے عشق ترا مقصد میں ہوں اے حسن تری منزل میں ہوں

تو کیا جانے تو کیا سمجھے رنگِ مجلس داب محفل
زیبائش یک محفل تو ہے آوارۂ صد محفل میں ہوں
یہ درد کی ساری شکلیں ہیں یہ سوز کی ساری شانیں ہیں
تو کچھ بھی ہوا ے شمع محفل لیکن ساری محفل میں ہوں
میں یاد میں تیری روتا ہوں دنیا مرے حال پہ روتی ہے
بیتاب کن یک دل تو ہے بیتاب کن صد دل میں ہوں
میکش مرے دم سے باقی ہے دُنیا میں نشاں اہل دل کا
ہو جان کوئی افسانے کی افسانہ نگار دل میں ہوں

1928

کھو گیا میں ترے جلوے کا نظارا کرکے
چھپ گیا تو مری حیرت کو تماشا کرکے
معرکہ حسن و محبت کا سرانجام ہوا

ہم نشیں رہنے دے مجھ سے غمِ اُلفت کو نہ پوچھ
اس کو حادث نہ سمجھ اس کی قدامت کو نہ پوچھ
اس کا آغاز ہوا اور نہ انجام ہوا

کون سمجھا کہ مرے سوز نہاں تھا کب سے
شمع ساں جل بجھا اور آہ نہ نکلی لب سے
آپ کے چاہنے والے کا یہ انجام ہوا

اس ادا سے کوئی آیا بام پر
ہوگیا دھوکا سحر کا شام پر
ہم سے کیا دیکھا جو پردہ کر لیا
حرف آیا عاشقوں کے نام پر
عہد کرکے آپ ہی جب پھر گئے
زور کیا ہے گردشِ ایام پر
شادی بے معنی ہے علت نہیں
مر مٹا ہوں پھر کسی گلفام پر
کس کو سمجھا ہوں تری پہلی نظر
مٹ رہا ہوں لذتِ آلام پر
مر گیا سن کر نویدِ وصلِ یار
رحمتِ حق میکش ناکام پر

یہ کیوں کہوں کہ نہیں آشنا زمانے میں
وہی ہے کیف ہے جس کو مرے ستانے میں
خدا کے نام پہ کرتے ہیں ہم بتوں سے وفا
نہ ہو جو قدر وفا کی نہیں زمانے میں
ہمارا سوز بھی ہے زیب ہر بیاں لیکن
تمھیں ہو جانِ فسانہ ہر اک فسانے میں
خلش تو تھی ہی میں خلش سے مگر فزوں تڑپا
اُسے بھی آج مزا آگیا ستانے میں
ہے خانقاہ میں بے جا تلاش میکش کی
ملیں گے آپ کو حضرت شراب خانے میں

برباد آرزو کو دیوانہ کہہ دیا ہے
اک لفظ کہہ کے تم نے افسانہ کہہ دیا ہے
تھے جن کو ناز وہ بھی مشکل میں پڑ گئے ہیں
سب کو تری نظر نے بیگانہ کہہ دیا ہے
میں نازشِ جنوں سے دیوانہ ہوگیا ہوں
جب اُس نے تنگ آکر دیوانہ کہہ دیا ہے
آزادِ دو جہاں ہوں ہاں تم برا نہ مانو
میں نے تو ایک فقرہ رندانہ کہہ دیا ہے
آنکھوں نے تیری کی ہے گو رہزنی ہی لیکن
خاطر سے تیری دل کو نذرانہ کہہ دیا ہے
میکش ہے اور ترکِ جام وسبو کہ آخر
آنکھوں نے تیری رازِ مے خانہ کہہ دیا ہے

پھر ذرا یادِ خمِ کاکلِ پیچاں ہوجائے
دل پریشاں ہے تو ہستی بھی پریشاں ہوجائے
ایک بار اور تماشا ہو تمھیں میری قسم
پھر تم آئینہ بنو آئینہ حیراں ہو جائے
یاد کرنا مری بربادیٔ دل کا منظر
جب پراگندہ خزاں سے گلِ خنداں ہوجائے
برہمی سے خمِ کاکل کی پریشاں ہیں آپ
دل کی کیا فکر ہے کتنا ہی پریشاں ہوجائے

تم مسلماں ہو تو اسلام ہے ایماں مرا
تم ہو کافر تو مجھے کفر ہی ایماں ہو جائے
ہے تری ضد سے فقط لطف شکایت ورنہ
میں پشیماں ہوں جو ظالم تو پشیماں ہو جائے
عشق کی کوئی حقیقت جو سمجھ لے میکش
تیری مانند شہید غم ہجراں ہو جائے

عنصر یہ ہیں ہماری دیوانی زندگی کے
تخئیل فلسفے کی جذبات عاشقی کے
کیا مجھ کو گمرہی عالم کا غم نہیں ہے
لیکن میں سن رہا ہوں کچھ عذر بیخودی کے
اے محوِ سازِ شادی سن میرا سوز غم بھی
سمجھانا چاہتا ہوں معنی تجھے خوشی کے

اللہ اللہ ترے حسن کی شہرت ظالم
میری رسوائی سے خالی نہیں محفل کوئی
بدگمانی ہے مجھے اور دلِ ناداں کو خوشی
مسکراتا نظر آیا سرِ محفل کوئی

تم نے دکھائی ہیں وہ چرا کر نگاہ کو
جو شوخیاں کہ چھوٹ گئی تھیں نگاہ سے

تعمیر کر رہا ہوں اُسی سے جہانِ دل
لایا تھا میں جو حشر تری جلوہ گاہ سے
ہے زندگی محال تغافل سے آپ کے
دل بچ کے کیا کرے نگہ بے پناہ سے

الٰہی الاماں دردِ محبت میں نے مانگا تھا
طلب کس روز مجھ کمبخت کو تھی دردِ ہجراں کی
ہوئی صحرا نوردی ختم کب کی اے جنوں لیکن
کھٹک باقی ہے اب تک پاؤں میں خارِ مغیلاں کی
کوئی سمجھائے مجھ کو وقتِ رخصت کس لیے رویا
وہ ظالم تھی خوشی جس کو مرے حالِ پریشاں کی
تمھیں میں کیا سمجھتا ہوں تمھارا دل بتا دے گا
مجھے تم کیا سمجھتے ہو قسم تم کو مری جاں کی؟

سہتے سہتے غم محبت کے یہ حالت ہو گئی
ہنس کے بولا جو کوئی اُس سے محبت ہو گئی
خوش رہو دنیا میں تم ہم تو اسی میں شاد ہیں
تم سے مل کر رو لیے ہلکی طبیعت ہو گئی
شکر کیجیے یا شکایت اس نگاہِ ناز کی
جو عنایت بن کے آئی اور قیامت ہو گئی
1927

کل اس طرح اُن سے تصادم رہا
وہ سنورا کیے اور میں گم رہا
مرے دل کی بھی عمر اتنی ہی تھی
ترے لب پہ جتنا تبسم رہا
رہی بے سبب زُلفِ برہم تری
مرے دل کو کیا کیا توہم رہا
رہا میں بھی محفل میں اُن کی طرح
نگاہوں میں لیکن تکلم رہا
مرے سوز کی کیفیت اس میں تھی
لبوں پہ جو تیرے تبسم رہا
پلا کر ہی میکش رہا شیخ کو
بہت دیر جھگڑا سرِ خم رہا

میں حقیقت میں کبھی غیر پہ مائل نہ ہوا
نہ ملا اُس سے جو وجہِ خلشِ دل نہ ہوا
عمر بھر تیری تمنائیں مرے دل میں رہیں
دل مگر تیری تمناؤں کے قابل نہ ہوا
ہوگئی درد یہ درماں طلبی ہی یعنی
تم سے ملنے سے بجز رنج کے حاصل نہ ہوا
نہ ہو شرمندہ جفا کرکے میں قرباں تیرے
یہ عنایت بھی بہت ہے کہ تو غافل نہ ہوا
شمع کشتہ کا وہ منظر وہ وداعِ محفل
خیر یہ گذری کہ پروانہ محفل نہ ہوا

لوگ سمجھا کیے ہر رنگ میں شامل مجھ کو
ورنہ میکش میں کسی رنگ میں شامل نہ ہوا

کیسے کہہ دوں کہ کوئی نشۂ آغوش نہ تھا
اک ثبوت اس کا یہی ہے کہ مجھے ہوش نہ تھا
لذتِ درد نے دوری کو بنایا معزول
ورنہ اس کیف کے عالم میں وہ روپوش نہ تھا
جان دینا ہی تھا مقصودِ محبت میں مجھے
آپ کہیے کہ محبت میں مجھے ہوش نہ تھا
تھا قیامت کا نہ ہونا بھی قیامت مجھ کو
دل ستم کوش تھا جس دم وہ ستم کوش نہ تھا
بچے وعظ میں اور برسرِ منبر افسوس
آج مسجد میں مگر میکش سے نوش نہ تھا

کوئی دن میں خود ہی نہ ہوں گے ہم ہمیں کیا ہے رہا کوئی یا نہ رہا
وہ گئے تو گئے یہ قلق ہی رہے نہ رہے بھی تو کوئی سدا نہ رہا
جب دل نہ رہا تو خوشی نہ رہی جو خوشی نہ رہی نہ رہا غم بھی
جب غم نہ رہا تو خلش نہ رہی جو خلش نہ رہی تو مزا نہ رہا
ترا کل کا وعدہ کیا وعدہ مری آج کی تسکیں کیا تسکیں
تری یاد ہی تو ہے رہی نہ رہی مرا ہوش ہی تو ہے رہا نہ رہا
وہ آئے اور چلے بھی گئے دنیا کے غموں کو کیا کہیے
مجھے عشق کی کچھ بھی خبر نہ ہوئی مجھے حسن کا ہوش ذرا نہ رہا

مداے خلشِ سوزِ اُلفت مجھے تیرے ہی دم سے تسکیں ہے
مرے ساتھ جنونِ محبت میں کوئی ایک بھی تیرے سوا نہ رہا

چند آہیں چند قطرے خون کے
تھا یہ دل کا کاروانِ مختصر
سن چکے ہو نام سے جو قیس کے
تھی وہ میری داستانِ مختصر
وسعتِ دل اور تمنائیں تری
یہ ہجوم اور آستانِ مختصر
عشق اور پابندیِ آدابِ ہوش
لاکھ جھگڑے ایک جانِ مختصر
سنتے سنتے میری فرمانے لگے
اس کو کہتے ہیں بیانِ مختصر

اک شورش ہے تسکینِ دروں ہے ایک سکونِ شورش زا
معلوم نہیں خلوت میں ہوں محسوس نہیں محفل میں ہوں
وہ میری برائی ہی کے سبب آتا تو ہے تم کو دھیان مرا
تم دل میں ہو میرے تو کیا ہو میں ہوں کہ تمھارے دل میں ہوں

تم دل ہو تمنا کا تم دل کی تمنا ہو
تم کیف ہو دُنیا کا تم کیف کی دُنیا ہو

ہستی مری مٹتی ہو صورت تری جچتی ہو
میں جان سے جاتا ہوں تو دل میں سماتا ہو
ہے میرے جنوں میں بھی کچھ جذب نظر لیکن
جب تم ہو تماشائی پھر کیوں نہ تماشا ہو
تم دل کی مسرت ہو تو نور ہو آنکھوں کا
تم زینت خلوت ہو تم انجمن آرا ہو
یاد آئے تو میکش کا کچھ ذکر بھی اے ہمدم
اُن مست نگاہوں سے جب کیف برستا ہو

تو وجہ اضطراب ہوا یہ غضب تو دیکھ
گو جانتا ہے حال مرا لیکن اب تو دیکھ
جب تیری دید کے لیے لاکھوں دعائیں تھیں
اب موت کی طلب ہے جنونِ طلب تو دیکھ
مانا کہ شانِ حسن ہیں بے التفاتیاں
تیری طرف نہ دیکھ رہا ہوں میں جب تو دیکھ
بیٹھے ہیں کس طرح سے ترے در کے سامنے
ان ساکنانِ دشت جنوں کا ادب تو دیکھ
دیوانہ زلف کا ہوں مرا حال اے طبیب
اب دیکھ اور چھانے لگے شام جب تو دیکھ
میکش نے جان دی ترے ہنسنے کی آن پر
کتنا حسین ہے اس کی قضا کا سبب تو دیکھ

دمِ وداع وہ نیچی نظر معاذاللہ
ہے خوں بہائے تمنا مگر معاذاللہ
وہ سو کے اٹھنے کا عالم ترے ستم پہ ستم
وہ زلف چھائی ہوئی تا کمر معاذاللہ

اب بھی دزدیدہ نگاہِ ناز ہے
کیا مرے رونے میں بھی کچھ راز ہے
بن گئے افسانے میری آہ کے
خامشی تیری کہ اب بھی راز ہے
دیکھنے والے کی آنکھیں دیکھیے
آپ کو صورت پہ اپنی ناز ہے
ہو چکی ناکامیوں کی انتہا
اور اُلفت کا ابھی آغاز ہے
میکش و انکارِ بادہ حیف نظر
لاؤ ساغر یہ بھی اک انداز ہے

ہوش لازم ہے یہ مجمع عام ہے
بام ہے اے جلوہ افگن بام ہے
صبح نومیدی کا کیوں کرتا ہے ذکر
اے مریضِ غم ابھی تو شام ہے
زیست میری اور یہ ایامِ فراق
اے امیدِ وصل تیرا کام ہے

ہم کو ناکامِ محبت کیوں کہو
مرگِ ناکامی ہمارا کام ہے
اب تو آجاؤ کہ ہے صبحِ فراق
اب تو آجاؤ کہ بھری شام ہے
پردے والوں سے تغافل کا گلہ
کیوں کروں جب لذّتِ آلام ہے
بسملوں کا دل مگر دیکھا نہیں
تیغ کو کہتے ہو خوں آشام ہے
عاشقی اور عقل کی پابندیاں
سچ یہ ہے میکش تمہارا کام ہے

دشمن کی تباہی کی خاطر سامان لیا ہے دشمن سے
یہ عشق کی بجلی پیدا کی ہے ہوش وخرد کے خرمن سے
تیری وہ نظر، پروردۂ دل دنیا جسے بجلی کہتی ہے
گرتی ہے میرے نشیمن پر بچتی ہے میرے نشیمن سے
صحرا کو نہ ہو نکہت کی طلب کیا میں نہیں وسعتِ صحرا میں
ہے رنجِ چمن کے پھولوں سے شکوہ ہے نسیمِ گلشن سے
ہو جایا کرے کچھ ذکر کبھی ناکامِ محبت میکش کا
جب اُٹھتے ہو تم بستر سے یا لوٹتے ہو جب گلشن سے
1926

جب اُس کو ڈھونڈتے تھے تو دل بھی نہ تھا کہیں
اب دل کیا تلاش تو وہ بھی وہیں ملا

کس سوزِ دل سے تم کو بنایا ہے اے بتو
تم سے نشانِ ذوقِ جہاں آفریں ملا
اس کو گریز بھی ہے ملاقات سے مری
خوش ہو کے مسکرا بھی دیا جب کہیں ملا
یارب شب فراق مرا دل کدھر گیا
اک قطرہ خوں سحر کو سر آستیں ملا
آئے وہ میرے دل میں تو دل کو اُجاڑ کر
برباد جب مکان ہوا تب مکیں ملا
میکش سے تھی بہار تری بزمِ ناز میں
اب تو جہاں ملا ہمیں اندوہ گیں ملا

زباں سے میری کیا نکلا تم ایسے سرگراں کیوں ہو
خموشی جب بیاں ہو شکوۂ طرزِ بیاں کیوں ہو
تمھارے حسن کا قصہ ہو یا میری محبت کا
جسے دل میں چھپائیں ہم وہ زیب داستاں کیوں ہو
اگر مٹنا مسلم ہے تو تجھ پر کیوں نہ مٹ جائے
ترے ہوتے ہوئے آخر یہ دنیا رائیگاں کیوں ہو
اگر مسرور ہو دل سے تو کیوں بیزار ہو مجھ سے
اگر بے زار ہو مجھ سے تو دل میں مہماں کیوں ہو
یقیں کیا ہوگیا تم کو مرے دنیا سے جانے کا
نہیں تو یہ بتادو آج اتنے مہرباں کیوں ہو
اس آئینے میں جس کو عشق کہیے عکس کس کا ہے
نہیں جب درمیاں میکش تو اس سے بدگماں کیوں ہو

ہاں ہاں مرا قصور تھا ایسے خفا نہ ہو
قربان اس ادا کے کوئی دیکھتا نہ ہو
ثابت ہوا فضول ہے اظہارِ آرزو
کہیے تو کیا ہوا اور نہ کہیے تو کیا نہ ہو
یارب مرے جنونِ محبت کی ابتدا
ایسے کے ہاتھ سے ہو کہ پھر انتہا نہ ہو
1925

تمھیں کو شوق نہیں کچھ مجھے ستانے کا
ملا ہے دل تو یہی رنگ ہے زمانے کا
تمھارے حسن کا شہرہ مرے فسانے سے
تمھارے حُسن سے شہرہ مرے فسانے کا
ہمیں تو کوئی حسینوں میں با وفا نہ ملا
تمھارا ذکر نہیں ذکر ہے زمانے کا
مجھے بھی اب تو تردّد ہے عذرِ وحشت میں
نگاہِ مہر نے خوں کردیا بہانے کا
وہ لاش میکشِ ناکام نوجواں کی چلی
ستم ہے اُف یہ نتیجہ ہے دل لگانے کا

بھر گئیں آنکھوں میں تیری بزم کی رنگینیاں
میں نے دیکھا جس بیاباں کو گلستاں ہوگیا

اس ادا سے میں نے دیکھے داغ اپنے خون کے
اک تماشا روز محشر ان کا داماں ہوگیا
کرچکے بس تم علاج درد پنہاں کر چکے
ہو گیا تم سے علاج درد پنہاں ہوگیا
کون ہے ایسا پجاری دیر میں اب اے بتو
کیا کرو گے تم اگر میکش مسلماں ہوگیا

کیوں ہو نادم تم مری بربادیاں ہونے کے بعد
اور افسانہ کوئی یہ داستاں ہونے کے بعد
کھل رہی ہیں مجھ پہ وحشت کی ادائیں کس قدر
کیا بھلا لگتا ہے دامن دھجیاں ہونے کے بعد
آج سن لیتے مرا افسانۂ درد والم
پھر بھلا کس کی سنو گے تم جواں ہونے کے بعد
مٹ گیا آخر کو میں بے التفاتی سے تری
حسرتیں بڑھتی گئیں ناکامیاں ہونے کے بعد
دل میں پہلے ہی تمنا کی خلش کچھ کم نہ تھی
اور آفت ہوگئے تم مہرباں ہونے کے بعد
آتے آتے میرے گھر شاید وہ کافر رہ گیا
چھا گئی افسردگی بیتابیاں ہونے کے بعد
کوئی پوچھے تو خدا را آج انھیں کیا مل گیا
کس قدر خوش ہیں وہ مرے رازداں ہونے کے بعد
دل میں آنکھوں سے اترنا ہی قیامت ہوگیا
آپ تو جان ہوگئے دل میں نہاں ہونے کے بعد

کیا کہے گا کوئی میکش اب یہ کھلا بھی گیا
ہوگئے آزاد ہم بدنامیاں ہونے کے بعد

اک تری نرگسِ مخمور کی مستی کے سوا
اور دنیا میں کوئی شے مری ہمراز نہیں
سن لیے کشف وکرامات کے قصے واعظ
دلربائی سے زیادہ کوئی اعجاز نہیں
آپ اترائیں نہیں آپ کو معلوم نہیں
بیخودی میں جو کہا ہے وہ مرا راز نہیں
ایک تم ہو کہ جفاؤں پہ بھی اتراتے ہو
ایک ہم ہیں کہ وفاؤں پہ ہمیں ناز نہیں
ہوگئی مست فضا روح ہوا میں دوڑی
موج ہے قلزمِ مے کی تری آواز نہیں

آتے ہیں مضطرب مرا نامہ لیے ہوئے
ہے ہر نظر جوابِ تمنا لیے ہوئے
وہ چپ ہیں اور لبوں پہ تبسم ہے موجزن
انداز میں خموشیِ گویا لیے ہوئے
بیٹھا ہوا ہوں غرقِ خیالِ حبیب میں
موجِ نفس میں کیف کا دریا لیے ہوئے
جاگ اے جنوں کہ قافلہ اترا ہے مصر میں
تعبیرِ خوابہائے زلیخا لیے ہوئے

سنتے ہیں آج مجھ سے وہ مجنوں کی داستاں
چہرے پہ شانِ عصمت لیلا لیے ہوئے
"یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں"
وہ چپ ہیں اور کیف کی دنیا لیے ہوئے
اک دور ہی میں صبحِ قیامت ہوئی طلوع
بیٹھا ہی تھا میں ساغر و مینا لیے ہوئے
دیکھو ادھر بھی ایک نظر تم کہ میں بھی ہوں
نظروں میں داستانِ تمنا لیے ہوئے
ہیں منفعل سے آج وہ میکش کی یاد میں
ہر آنکھ میں خمار کی دنیا لیے ہوئے

تم اُٹھ گئے اور یہ مرے پہلو سے نہ سرکی
جاں ہو کے رہی دل میں خلش تیرِ نظر کی
کہتے ہیں کہ اب شکوہ کنِ درد نہیں ہے
یہ ہے تو مریضِ غمِ فرقت نے سحر کی
ٹھنی رہی شب جلوۂ مدہوش پہ اُس کے
یوں رات مرے گیسوؤں والے نے سحر کی
چہرے سے نمایاں ہی رہی قلب کی حالت
اُبھری ہی رہی چوٹ تری ترچھی نظر کی
بے دیکھے حسینوں کے میں رہ ہی نہیں سکتا
معذور ہوں میں مجھ کو شکایت ہے نظر کی
ہے وقتِ دُعا میکشِ بیمار کے حق میں
اب پوچھنے بیٹھے ہو خلشِ دردِ جگر کی

مدعی خود ہے خونِ بسمل کی
اُف وہ نیچی نگاہ قاتل کی

تم نے کیوں ناز سے مجھے دیکھا
اب مجھی پر نظر ہے محفل کی

میرے رونے پہ رو دیے وہ بھی
بدگمانی نکل گئی دل کی

اے زہے دل کہ ان کی خلوت میں
یاد ہوتی رہی مرے دل کی

تجھ سے ملنے سے اے سراپا ناز
وحشتیں اور بڑھ گئیں دل کی

خاک چھوٹے گا عشق اب میکش
ابتدا ہی بگڑ گئی دل کی

آپ کا عشق وجہ ہستی ہے
میری فطرت میں بت پرستی ہے

لگ گئی آگ جیب و داماں میں
اب جنوں کو فراغ دستی ہے

تیری آنکھوں میں ہے جو ہشیاری
وہ مری شکل پر برستی ہے

میں ہوں شاکر تری جفاؤں پر
یہ بھی اک شانِ فاقہ مستی ہے

آرزوئے وصال روزِ فراق
کس قدر مجھ پہ قہر ے کستی ہے
آج میکش کے خوب گہرے ہیں
اُن کی نظروں سے مے برستی ہے

ہجر میں بھی تو نہیں فرصتِ فریاد مجھے
مسکرادیتا ہوں آتا ہے وہ جب یاد مجھے
کس طرح مان لو ناصح اُسے بے مہر کہ وہ
نہ خفا ہو مرے رونے پہ نہیں یاد مجھے
مٹ گئی رسمِ وفا ختم ہوئی مشقِ جفا
ہو چکی آپ کی ضد کر چکے برباد مجھے
اب تو اِس دردِ جدائی کے سوا کچھ بھی نہیں
نہ وفا یاد ہے تیری نہ جفا یاد مجھے
جب شبِ عیش میسر ہو تجھے اے ظالم
میری حسرت کی قسم جو نہ کرے یاد مجھے
گرمیِ بزم کی اے دوست نہ رکھ مجھ سے اُمید
اب نہ وہ دل ہے نہ وہ دلکشیاں یاد مجھے
غمِ فرقت سے نبھائی ہے ہمیشہ میں نے
وصل کی کی ہو تمنا تو نہیں یاد مجھے
مست ہے سارا زمانہ ترے میکش کی قسم
نہ ملیں تیری نگاہیں کہیں برباد مجھے

یہ میں نے کس کو دیکھا یہ دل نے کس کو پایا
یہ کس کی آرزو ہے یہ کس کا مدعا ہے
اک اک ادائے نوشیں دوشیزگی میں گم ہے
ہے چال ایسی جیسے ساغر چھلک رہا ہے
تیور چڑھے ہوئے ہیں نظریں جھکی ہوئی ہیں
زلفیں کھلی ہوئی ہیں آنچل ڈھلا ہوا ہے
کس درجہ ہے تصنع اور پھر بھی سادگی ہے
ہے کس قدر تغافل اور پھر بھی دلربا ہے
جس طرح گم شدہ کو مل جائے راہ منزل
اس طرح اس سے مل کر دل ٹھہر سا گیا ہے
مدت تک اس سے اتنی رسم سخن رہی ہے
میں مسکرا دیا ہوں وہ مسکرا دیا ہے
سب کی نظر بچا کر میں اس کو دیکھتا ہوں
میری نظر بچا کر وہ مجھ کو دیکھتا ہے
ناکامِ آرزو ہوں بدنامِ آرزو ہوں
ناکام رہ گیا ہوں بدنام کردیا ہے
1924

تقدیر دل کہ راز جنوں برملا ہوا
کیا کچھ نہ تھا نظر میں تمھاری چھپا ہوا
ہیں مستفیض یادِ چمن میری وحشتیں
وہ خار چن لیا جو نظر آشنا ہوا

پردے میں یہ کشش تری اے حسن مضطرب
میں بے خبر تھا اور یہ دل مبتلا ہوا
رودادِ کامیابیِ دل مختصر یہ ہے
جو ہوگیا فنا وہ مرا مدعا ہوا
سب ہم سفر گذر گئے عشق مجاز سے
میں بدنصیب رہ گیا منہ دیکھتا ہوا
بے دل وہیں میں رہ نہ سکا کیوں یہ کیا کہوں
کچھ کہہ رہا تھا رنگ تمھارا اڑا ہوا
پہلے ہی کم نہ تھا مجھے اے دل جنونِ شوق
پردہ اُٹھا تو اور ستم برملا ہوا
ہنسنا پڑا انھیں مرے حالِ تباہ پر
مجھ سے تو عشق میں ستم ان پر سوا ہوا
میکش فنا ہی چارۂ سودائے عشق ہے
لو آج آ کے مل بھی گئے وہ تو کیا ہوا

دل اس ہجومِ جلوۂ جاناں میں رہ گیا
کچھ یاد ہے کہ زلفِ پریشاں میں رہ گیا
جیتا اگر تصورِ جاناں تو دیکھتے
لیکن خیال زلف پریشاں میں رہ گیا
1923

اُس دن کہ خود نمائی کا اُن کو خیال تھا
بسمل وہ خود بھی ہوگئے میرا یہ حال تھا
کم ہمتی سے اپنی میں جیتا رہا مگر
جب انتہا ہوئی شبِ غم کی وصال تھا

مجھ سے ملے تھے وہ کبھی ہے یہ مجھے خیال سا
رونقِ بزمِ بیخودی تھا تو سہی وصال سا
اُن کے شباب و ناز سے اور مرے ضبطِ راز سے
آنکھوں میں ہے خمار سا سینے میں ہے اُبال سا
اُن کی نگاہِ مست کی آنچ میں نذر ہوگیا
اُڑنے لگا غبار سا مٹنے لگا خیال سا
حسن کو جس پہ ناز ہے عشق کا سوز و ساز ہے
دل میں ہمارے داغ سا رُخ پہ تمھارے خال سا
دیکھا تو ہے بہت اُسے آج یہ کیا ہوا مجھے
پہلو میں اک کھٹک ہوئی جم گیا اک خیال سا
پوچھیں تو آپ جہاں تک کر آیا ہے کون کس کے گھر
بیٹھتا اُٹھتا شکل گرد آپ کا پائمال سا
کیا ہوا کیسے بیٹھے ہو میکش خستہ کے بغیر
چہرے پہ ہے ملال سا آنکھوں میں اشتعال سا

اُنھیں پردہ کہ یہ وحشی مجھے رسوا نہ کریں
اور دیوانوں کو وحشت کہ وہ پردا نہ کریں

حسرتیں ہونٹوں پہ آمادۂ گستاخی ہیں
کہیے ہم آپ کو ہشیار کریں یا نہ کریں
مجھے جلوے کی طلب عشق کو تسکیں سے گریز
وہ کریں رحم مرے حال پہ اب یا نہ کریں
کہہ دو موسیٰ سے کہ سن جائیں بتوں کی پہلے
نہ کیا ہو تو ابھی طور کا سودا نہ کریں
پھر سنبھالے بھی نہ سنبھلیں گے جناب میکش
چشم میگوں سے حضور ان کا مداوا نہ کریں

یہ سچ کہتے ہو تم اُلفت میں مٹ جانا بھی ہوتا ہے
مگر آ جاؤ تم تھامے جگر ایسا بھی ہوتا ہے
ہمارا عشق اک صورت ہے اُن کے حسن کامل کی
وہ ہوتے ہیں تو اُن کا دیکھنے والا بھی ہوتا ہے
1922

شرمندۂ نگاہِ کرم ہو کے رہ گیا
شکوہ زباں پہ شکرِ ستم ہو کے رہ گیا
ہے ہے وہ شوق آپ کے مشتاقِ دید کا
جو دل میں ٹیس آنکھ میں نم ہو کے رہ گیا
انجام اپنے سوز کا اے بے خبر نہ پوچھ
اک تیر تھا کہ سینے میں دم ہو کے رہ گیا

حسرت پہ کیوں نہ روئیے مقتولِ عشق کی
دوچار روز آپ کو غم ہو کے رہ گیا
تم کو تو ایک یہ کہ نہ آئے مگر یہاں
شوقِ وصال ہجر کا غم ہو کے رہ گیا
تم نے کیا یہ قتل مجھے ایک روز بھی
یہ شوق دل میں تیغِ ستم ہو کے رہ گیا
سیمابؔ یہ ناتمامیٔ تاثیرِ غم تو دیکھ
یعنی کسی کو شوقِ ستم ہو کے رہ گیا

غایتِ قرب ہوا وجہ حجاب
کاش کچھ دور وہ ہم سے ہوتا
الاماں تیرے غضب کے شعلے
کیا مرے دیدۂ نم سے ہوتا
چھوڑتے تب بھی نہ خوبانِ جہاں
دل اگر صید حرم سے ہوتا

یہ کیا کہ حلق پہ خنجر چلا کے ہنس دینا
یہ کیا کہ خاک میں ہم کو ملا کے ہنس دینا
نہ چھیڑیئے مجھے بیٹھا ہوں جان سے بیزار
کوئی ثواب ہے مجھ کو رُلا کے ہنس دینا
وہ ہاتھ جوڑ کے آنکھوں سے التجا میری
وہ اُن کا ناز سے نظریں چُرا کے ہنس دینا

سنبھالنا مجھے میکش کہ یاد آتا ہے
کسی کا دیکھنا اور مسکرا کے ہنس دینا

آیا تری آنکھوں سے مشکر ابھی کچھ اور
بیٹھا مرے پہلو میں تڑپ کر ابھی کچھ اور
کب تک یہ ستم ہم پہ ہے کب تک یہ تغافل
کب تک یہ کہے جاؤ گے ہنس کر ابھی کچھ اور
مرتے ہیں مگر کیسے کریں عشق سے توبہ
کہتا ہے شباب اُن کا چمک کر ابھی کچھ اور

کیا کریں گے وہ امتحاں میرا
بارہا آزمائے بیٹھے ہیں
میں ہوں سرکار مجرمِ الفت
آپ کیوں منہ چھپائے بیٹھے ہیں

فضا بھاتی نہیں باغ جناں کی
خبر لادے کوئی کوئے بتاں کی
سحر سے دل نہیں ٹھہرا ہے میرا
ہوا آئی تھی کیا کہیے کہاں کی
قیامت آگئی اے بیکسی کیا
سفر میں یاد اور کوئے بتاں کی
وہ دزدیدہ نظر وہ مہر مخفی
ستم ہے یاد عشق ناگہاں کی

وہ روئیں وقتِ رخصت اب ہمیں کیا
رسائی ہائے آہِ ناتواں کی
ترے کوچے کی ہوجائے تو اچھا
خدا جانے یہ مٹی ہے کہاں کی
نہ پوچھیں آپ حالِ مرگِ میکش
عجب حالت ہوئی اس نوجواں کی

کوئی دن اب تو ہم بھی جذبِ دل کو آزمائیں گے
نہ جائیں گے کبھی جب تک نہ وہ ہم کو بلائیں گے
گئے وہ آہ ہم بھی اب چلے خوں ہو چلا دل بھی
سنالیں اور کچھ ناصح کہ پھر ہم کو نہ پائیں گے
جگر پانی ہو یا دل خوں مجھے سب ناگوار ہے
نہ ہو افسوس جب وہ ہی تو یہ کس کو دکھائیں گے
وہ مجھ کو دیکھ کر خوش ہونے والے کیا ہوئے میکش
رُلا کر اب مجھے ہمدم مرے کس کو ہنسائیں گے

آئے اِدھر اُدھر سے وہ اور وار کر گئے
ٹھہری یہی جو اُن کی ادا ہم تو مرگئے
ناکام جو تمھاری محبت میں مر گئے
سچ پوچھیے اگر تو بڑا کام کر گئے
آنکھیں ہیں بند اور تصور ہے آپ کا
مجھ کو اسی طرح سے مہینے گذر گئے

شرما کے منہ کو پھیر لیا مسکرا دیے
مرہم طلب کیا تھا وہ اور وار کر گئے
سنتے تھے ہم کہ بعد قیامت ہے زندگی
جس دن سے لیکن آپ گئے ہم تو مر گئے
1920

محدود لا مکاں میں ہمارا خدا نہ تھا
کی جس کی حمد لائق حمد و ثنا نہ تھا
تو پاس تھا تو کون سے دُکھ میں مزا نہ تھا
کب تھا وہ درد جو مرے دل کی دوا نہ تھا
خود بینیاں صحیح تکبر بجا درست
اچھے ہیں آپ دل بھی ہمارا بُرا نہ تھا
مرتے ہیں ان کے ہجر میں یہ بھی زمانہ ہے
ہر وقت تھے وہ سامنے وہ بھی زمانہ تھا
اللہ بخشے میکش عاشق مزاج کو
سب کچھ سہی مگر وہ بتوں سے بُرا نہ تھا

اچھا کیا تصور دندانِ یار نے
اُن کو ہنسایا مجھ کو رُلایا تمام رات
بھولے وہ ایسے یاد میں گزرا تمام دن
ایسے ہنسے کہ مجھ کو رُلایا تمام رات

نشاں جو ترے درکا پائے ہوئے ہیں
وہ دونوں جہاں کو بھلائے ہوئے ہیں
ستم سہہ کے بھی ہم ہیں مشتاق ان کے
وہ دل لے کے کیوں منہ چھپائے ہوئے ہیں
میں بلبل کا نالہ ہوں میکش جہاں میں
یہ سب گل مرے ہی ہنسائے ہوئے ہیں

پھر رہی ہے وہ بزم آنکھوں میں
یادِ صحبت بھی خوب صحبت ہے
پوچھتے ہو کیا ہو تم کہ موت ہے کیا
وہ بھی اک غمزدہ کی حسرت ہے
وہ گئے حشر جو اُٹھاتے تھے
وہ نہیں ہیں تو کیوں قیامت ہے
اے فسوں گر ترا کمال نہیں
دل کا دینا ہماری عادت ہے

وہ میرے جذبۂ دل کی ہی ایک صورت ہے
پڑے جو مجھ پہ تمھاری نگاہ کیوں کر ہو

پہلے میں نے جان دی تم پر ضرور اتنا تو ہے
اور جفا تم کو سکھائی ہاں قصور اتنا تو ہے

اب کہاں تم اور کہاں ہم اور وہ محفل مگر
دل سے جاؤ گے کہاں دل میں سرور اتنا تو ہے
آپ کی محفل میں آنے کا ہوں میں مجرم مگر
آپ میرے دل میں کیوں آئے قصور اتنا تو ہے
شکل اُس مہوش کی ہے ہردم مرے پیش نظر
شب اندھیری ہی سہی فرقت کی نور اتنا تو ہے

نہ بے حجاب کبھی میں نے ان کو دیکھا ہائے
خیال میں بھی وہ آئے ہیں منہ چھپائے ہوئے
ہوا ہوں پیدا ہزاروں امیدیں لیکر میں
بچیں جو سینے سے ہاتھوں میں ہوں چھپائے ہوئے
لحد میں ساتھ لیے جارہا ہوں اے میکش
گلے لگانے کی حسرت گلے لگائے ہوئے

جنوں میرا زُلفیں تری اور ناصح
مقدر سے ہیں سب ہی اُلجھانے والے

وائے حسرت اک نظر میری طرف وہ دیکھ لیں
کاش آنکھوں ہی سے میں کہہ دوں جو میرے دل میں ہے

اگر وحشت نہیں میری سی تجھ کو بھی تو پھر کیا ہے
مری آنکھوں میں کیوں ہر دم تری تصویر پھرتی ہے
خرابات و حرم میں آج کل تیرا ہی قبضہ ہے
تصور دل میں آنکھوں میں تری تصویر پھرتی ہے

کبھی ستم کو ستم نہ سمجھے فراق کو بھی الم نہ سمجھے
ہوئے جو بیخود تو ہم نہ سمجھے کہ ذوقِ ہجر و وصال کیا ہے
وہ اس طرح سے ہے جلوہ فرما کہ طالب دید ہے زمانا
جو ہم سے مد نظر سے تھا چھپنا ظہور کا نام کیوں کیا ہے
میں اپنی حالت پہ کیوں ہوں پرغم جہاں میں کوئی نہیں ہے خرم
جو دل ہے غنچوں کا تنگ ہر دم گلوں کا سینہ پھٹا ہوا ہے
یہ کمسنی تیری اور یہ مضموں یہ فکر سالم یہ طبع موزوں
ضرور حاسد کا دل ہو پرخوں کہ تو نے میکش غضب کیا ہے

لیا دل کیا جو تیرا دل نہیں ہے
میں ہی بسمل ہوں تو قاتل نہیں ہے
میں ہی دیتا ہوں جاں میری ہی عادت
یہ میں نے مانا تو قاتل نہیں ہے
خلش ہے ہر گھڑی سینے میں میرے
ترا پیکاں ہے میرا دل نہیں ہے
خدا یا تجھ میں تو قدرت ہے اس کی
جو میکش بخشے قابل نہیں ہے

عشق سے کون سا دن تھا کہ میں بیزار نہ تھا
کب دُعا وصل کی تھی جس میں مناجات نہ تھی
کون سے دن تھی وفا تیری جفا سے خالی
کون سی تھی وہ جفا جس میں مدارات نہ تھی
قتل کرنے میں مرے دیر ہوئی کیوں اتنی
ایک آنکھوں کا اشارہ تھا کوئی بات نہ تھی
اب نہ بولوں گا جو مرضی نہیں تیری لیکن
بات کرنی مری تمہید شکایات نہ تھی
عام لوگوں نے نہ سمجھا تو نہ سمجھا میکش
کون سی بات تھی تیری جو بڑی بات نہ تھی

ازابتدا تا 1919

نظمیں

نغمہ حیات

چلی نہ موت کی پیری حیات کے آگے
ہزار قصر گرائے تو سو ہزار بنے
وہ برگ و بار خزاں نے کیا تھا خاک جنھیں
گلوں کا رنگ بنے غازۂ بہار بنے
کیا تھا بادِ حوادث نے منتشر جن کو
سمٹ سمٹ کے وہ ذرّے ہی کوہسار بنے
رُخِ زمیں پہ لگے جب بھی ناخنِ گیتی
ہر اک خراش سے سو لاکھ آبشار بنے
کیا تھا ظلم کے پنجوں نے جن دلوں کا خوں
وہ گل چمن میں پہاڑوں میں لالہ زار بنے
نہیں ہے ڈر ہمیں اس دور کی تباہی سے
ہم آفتاب بنائیں گے اس سیاہی سے

سنگ و شرار

یہ تاب یہ پرواز کہاں عمرِ ابد میں
کہتا ہوا جاتا ہے یہ ٹوٹا ہوا تارا
پوچھے دلِ قلزم سے کوئی کیفِ تلاطم
ساحل کو مبارک رہے طوفاں سے کنارا
یہ نور ہے پگھلی ہوئی شمعوں کی بدولت
یہ حسن ہے بکھری ہوئی زلفوں کا اشارا
مٹتا ہوا منظر یہ گزرتا ہوا عالم
اچھا ہے جو اس موت سے زندہ ہو نظارا
اک خس بھی ہوا یوسفِ کنعانِ توجہ
جس وقت اسے چاہ نے گلخن کے پکارا
بے جہد و عمل کچھ بھی نہیں عمرِ خضر بھی
مقصد کے لیے ہو تو ہے مرنا بھی گوارا
ہے زندگی فرہاد کی اک ضربتِ تیشہ
معلوم ہوا سنگ سے بہتر ہے شرارا

خاتمہ زمینداری

قوانینِ سرکار بدلے گئے
کسانوں کے غمخوار بدلے گئے

وہی جام و مینا وہی رنگ مے
فقط ایک مے خوار بدلے گئے
ہوئے شہر دیہات دیہات شہر
زبانوں کے معیار بدلے گئے
زمانے نے کی ہے ترقی بہت
جفاؤں کے ہنجار بدلے گئے
گناہوں کی نکلیں گی راہیں نئی
پرانے گنہگار بدلے گئے
ہوئیں ختم ایسے زمینداریاں
کہ جیسے زمیندار بدلے گئے

1952

منجم

ہیں زائچے میں منجم کے سارے سیارے
وہ خود جہاں کی ہے مخلوق وہ زمیں ہی نہیں
نگاہ چرخ سے اوپر خیال عرش کے پار
مگر جو سامنے ہے اس کو دیکھتا بھی نہیں

انسانِ کامل

یہ جہاں بھی تو ہے اس کی آخری منزل بھی تو
بانیِ محفل بھی تو ہے خاتمِ محفل بھی تو

بوئے گل کا ہے تعلق برگِ گل سے جس طرح
میری دُنیا سے علیحدہ بھی ہے تو شامل بھی تو
تجھ سے ظاہر کی تجلی تجھ سے باطن کا ثبوت
شاہدِ محمل نشیں بھی ہے تو ہی محمل بھی تو
آسمانوں پر ترا جلوہ زمیں پر تیرا نور
پر توِ معبود بھی تو بندۂ کامل بھی تو
تو نظر میں ہو تو طوفاں کیا ہے موجِ بحر کیا
قعرِ دریا میں بھی تو ہی ہے سرِ ساحل بھی تو
تو مآلِ عاشقی ہے تو کمالِ حسن ہے
شمعِ محفل بھی ہے تو پروانۂ محفل بھی تو
جس کی یزداں کو تمنا جس کی عالم کو تلاش
وہ سرورِ جاں بھی تو ہے وہ سکونِ دل بھی تو
تیرا میکش، تیرا ساقی، تیری محفل، تیرا جام
حاصلِ مستی بھی تو ہے مستی حاصل بھی تو

دل اور حُسن

زمیں پر جس طرح اُڑتا ہوا سایہ پرندوں کا
نظر کے ساتھ ہو جاتا ہے گم سا کن دھندلکوں میں
نگاہیں آخر آجاتی ہیں واپس اپنے مرکز پر
پرندے تھک کے گر جاتے ہیں اپنے آشیانوں میں
تصور کی فضا میں عکس رہ جاتا ہے سائے کا
پرندے ہیں فضاؤں میں نہ سایہ ہے نگاہوں میں
مرے دل اور تمھارے حسن کا ایسا ہی عالم ہے

کرن سورج کی جیسے صبح دم آتی ہے گلشن میں
پتوں پر گوہرِ شبنم کو پا کر مسکراتی ہے
گلوں کے رُخ سے اُڑ جاتا ہے آب و رنگ و شبنم کا
پشیمانی کی لہروں میں کرن بھی ڈوب جاتی ہے

تخیل کے چمن میں ذکر رہ جاتا ہے شبنم کا
کرن ہی مسکراتی ہے نہ شبنم جگمگاتی ہے
مرے دل اور تمھارے حُسن کا ایسا ہی عالم ہے

زمیں پر پھول برساتے ہیں جب برسات کے بادل
ہزاروں روپ لے کر زندگی سونا اُگلتی ہے
خزاں کا رہزن اپنا زرد پرچم لے کے آتا ہے
چمن سے امتیازِ خار و گل کی دھوپ ڈھلتی ہے
گلوں کا دھیان رہ جاتا ہے دل میں خشک پتوں کے
بدل جاتا ہے عالم ہی ہوا جب رُخ بدلتی ہے
مرے دل اور تمھارے حُسن کا ایسا ہی عالم ہے

بدل جاتا نہیں لیکن مزاجِ شاہدِ ہستی
زمیں کے سرد ہونے پر بھی لاوا دل میں بہتا ہے
ہزاروں نکہتیں رہتی ہیں غلطاں خاکِ گلشن میں
خزاں کے روز بھی گلشن کو صحرا کون کہتا ہے
ردائے شام میں ہوتا ہے روئے صبح پوشیدہ
شکستہ ساز میں بھی نغمہ برباد رہتا ہے
مرے دل اور تمھارے حُسن کا ایسا ہی عالم ہے

عزمِ مجبور

وہ آنکھ جو کبھی مل کر رہے نہ بے مارے
مرے ہوؤں کو تم اس سے جلا بھی سکتے تھے
بغیر وجہ ہمیشہ یہ بے رُخی بھی سہی
بغیر وجہ کبھی مسکرا بھی سکتے تھے
نہ لے سکی مری ہمت جو وعدۂ فردا
بغیر وعدہ تم آتے تو آ بھی سکتے تھے

دماغ جس سے پگھل جائے کوہساروں کا
ہم ایسے لالہ رنگیں کھلا بھی سکتے تھے
خود اپنے خون سے طاقِ ہوس میں ہم ہر روز
چراغِ زہرہ و پرویں جلا بھی سکتے تھے
کیا ہے جس کی تمنا نے دل کو زیر و زبر
اُسی سے بزمِ تمنا سجا بھی سکتے تھے

250

بھڑک رہی ہے محبت کی آگ جو دل میں
غرورِ حسن کو اس سے جلا بھی سکتے تھے
مگر یہ مصلحتیں وقت کی بتائیں کیسے
جو آپ پوچھتے تو ہم بتا بھی سکتے تھے

اپنا تو بن

پھر بہار آئی نہایا اشکِ شبنم سے چمن
خون سے لالے کے ہیں دہکے ہوئے کوہ و دمن
آدمیت کا ہے خوں محفل میں بھی خلوت میں بھی
مجھ کو وہ دُنیا ملی ہے جس میں شہر اچھے نہ بن
ہوش میں لانے کو میرے کتنے دل بے چین تھے
ہوش جب آیا تو بے گانہ ہے ساری انجمن
پرچم آزادی کا لہرایا گیا کچھ اس طرح
میں یہ سمجھا مل گیا شاید غریبوں کو کفن
کل جو تم کہتے تھے وہ گر آج دہرائے کوئی
اپنے تھیلے میں سے کھڑکاتے ہو تم دار و رسن
خاک کو کب تک یہ سجدے ماہ و انجم کو بھی دیکھ
جانِ قدرِ آدمیت اے پرستارِ وطن

میری بربادی ہے پروانہ ہلاکت کا تری
"تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن"
(اقبال)

ضابطے کی زندگی

بے مسافر جیسے ہوتی ہے کسی منزل کی شام
آج کچھ ایسا ہی عالم تجھ پہ ہے چھایا ہوا
جس سے آئی تھی مرے باغِ محبت میں بہار
کیوں نظر آتا ہے اب وہ پھول کملایا ہوا
بن گیا ہے آج کیوں بت خانہ ہونٹوں پہ ترے
کل جو نغمہ تھا ربابِ شوق پہ گایا ہوا
جھک گیا ہے کس لیے رسم وتکلف کے حضور
کل جو سر تھا نازِ معشوقی سے خم کھایا ہوا
گھٹ گئی ہے سانس تک اس روزنِ در کی بھی آج
جس کا پردہ بھی کبھی رہتا تھا سرکایا ہوا
اس نظر کا تذکرہ بھی آج تجھ کو بار ہے
کل جنونِ آرزو تھا جس پہ اترایا ہوا

دل میں لہراتی ہے اُس اُڑتے ہوئے آنچل کی یاد
آج جو احرام کی مانند ہے چھایا ہوا
ہیں تصنع میں بھی ماضی کی حسیں یادیں مگر
چور سے دل کے ہر اک جملہ ہے تھرایا ہوا
سرسری نظریں، تبسم سرد، چہرہ ست ست
یا خموشی یا کوئی فقرہ ہے دُہرایا ہوا
لب نہیں بے رنگ رنگیں رُخ نہیں بے غازہ لال
بے اُلجھتی چال، خم زلفوں کا سلجھایا ہوا
لے گئی سب تازگی کیا ضابطے کی زندگی
ہاں مگر تجھ پر کسی ہم جنس کا سایا ہوا
1949

کرشمۂ دل

بغیر وعدہ نگاہوں میں اعتبار لیے
ادا میں کشمکش جبر و اختیار لیے
رباب و جام و شب ماہ و آبشار لیے
مزاج شاعر و طبع شراب خوار لیے
وہ آ رہا ہے مری سمت کوئی نا معلوم
وہ چال جس میں ہے لغزش بھی ہوشیاری بھی
وہ آنکھ جس میں ہے جرأت بھی شرمساری بھی
وہ فکر جس میں ہے دانش بھی خامکاری بھی
وہ ذوق جس میں ہے تقویٰ بھی میگساری بھی

وہ حسن جس میں ہے پوشیدہ عشق کا مفہوم
اگر چہ ہوگئی کچھ کم مرے چراغ کی لو
اگرچہ ہوگئی مدھم مرے شباب کی ضو

اگرچہ سست ہوئی جذب وانجذاب کی رو
اگرچہ پڑنے لگا دل پہ عقل کا پرتو
مگر اُسے مرا احوال کچھ نہیں معلوم
یقیں کی ضو مرے وہم وگماں پہ چھا ہی گئی
شمیم اس کی مرے پیرہن میں آ ہی گئی
مرے حواس پہ چھائی مجھے مٹا ہی گئی
وہ پاس آکے مری روح میں سما ہی گئی
زہے کرشمۂ دل آگئے اب مرا مقسوم
1947

آزادی

کارواں ہوا اپنا باریاب آزادی
زندہ باد زندہ باد انقلاب آزادی
شرق و غرب پر پھیلے نور و تاب آزادی
اب کبھی نہ ڈوبے گا آفتاب آزادی
تا ابد سلام اس پر رحمت مدام اُس پر
جس کے قلب پر اُتری یہ کتاب آزادی

اگست 1947

آؤ خورشید کو ہم طرۂ دستار کریں
جام مے ہاتھ میں لیں نیام میں تلوار کریں
اب وطن اپنا ہے دشت اپنے ہیں صحرا اپنے
ذرّے کو دشت کریں دشت کو گلزار کریں
آؤ پھر سارے فرشتوں سے کرائیں سجدہ
آسمانوں پہ پھر انسان کا دربار کریں
کیوں پڑھائیں نہ ہر انساں کو اناالحق کا سبق
کیوں نہ موقوف سزائے رسن ودار کریں
تھی اسیروں کو غلامی میں بہت آزادی
کاش اس مے سے غریبوں کو بھی سرشار کریں
ہے ابھی قضیہ سرمایۂ ومحنت باقی
کاش انصاف سے اس راہ کو ہموار کریں

1947

آزردگیِ بے سبب

(2)

اکثر اوقات سوءِ ظن سے ہوئی
دانشِ زندہ بدتر از مردہ
واقعیت ہے بطنِ شاعر میں
واقعہ ہے گمانِ نا بردہ
جب ڈشوں سے لیا گیا کھانا
کس طرح ہوگیا وہ پس خوردہ
ہے گنہ میرا امتثالِ امر
دوست جس سے ہوئے ہیں آزردہ
کہیں بکتی ہے رفعتِ رندی
نہیں انگور کا یہ افشردہ
نہ ہو احساسِ کمتری کا شہید
یہ ہر اک کا نہیں ہے دل گردہ
ہوش اور اس قدر غلط فہمی
جوش اور اس طرح سے افسردہ

1946

جبرِ آرزو

تیری تابِ حُسن سے ہر ایک دل معمور ہے
درد میں بھی لذتیں ہیں ظلمتوں میں نور ہے
مجھ کو اپنا داغِ محرومی چراغِ طور ہے
جو نظر سے دُور ہے وہ میرے دل سے دُور ہے
پھر بھی تیری آرزو پر دل مرا مجبور ہے

تجھ کو دُنیا میں ہر اک ذرّہ مقامِ غور ہے
مشغلہ ہے شوخی ہے صنعت ہے وفا ہے جور ہے
یاں مرے سازِ جنوں کا نغمہ ہی کچھ اور ہے
بے نیازِ بادۂ و خُم بے خودی کا دور ہے

پھر بھی تیری آرزو پر دل مرا مجبور ہے

میں خروشِ نیستاں ہوں تو ہے کلیوں کی چٹک
تو نسیمِ نرم رو ہے میں ہوں شعلوں کی لپک

میں ہوں بادِ تند و صرصر تو ہے پھولوں کی مہک
میں شعاعِ آفتاب اور تو ہے جگنو کی چمک
پھر بھی تیری آرزو پر دل مرا مجبور ہے

دے چکا مجھ کو زمانہ درسِ ہستی و عدم
بار ہے میرے سکونِ قلب پر شادی و غم
گر گئے میزاں سے میرے سنگہائے کیف و کم
چھوڑ آئیں میری راہیں منزلِ دیر و حرم
پھر تیری آرزو پر دل مرا مجبور ہے

عذرِ جنوں

مری نگاہ کا افسوں ہے اُن کے دل پر بھی
کیا ہے جن کی نگاہوں نے میرے دل پہ فسوں
بہت ہیں میری نگاہوں کے زخم کھائے ہوئے
پڑی تھی حسن پہ جن کے مری نگاہِ جنوں
کوئی بتادے مرے یاد کرنے والوں کو
کہ گاہ گاہ میں خود کو بھی بھول جاتا ہوں
نہیں کہ یاد نہ آتے ہوں مجھ کو وہ لیکن
کوئی بتائے کہ کس کس کی دل کو نذر کروں
بہت ہیں کام زمانے میں عاشقی کے سوا
بہت ہیں شغل مری عقل کو سوائے جنوں

تری خوشی کے لیے ہوں تیرے ساتھ مگر
مرا جنوں ترے دل کے لیے نہیں موزوں
1944

فتنۂ معصوم

ہے میرا رازِ جنوں ایک فتنۂ معصوم
ترا ہی ذکر ہے لیکن تجھے یہ کیا معلوم
کسے خبر کہ تو کس وقت باخبر ہوجائے
سرِ مژہ پہ رکھوں دل کی عرض بے مفہوم
ابھی چمن میں ترے خار ہیں نہ نکہتِ گل
ترا ستم بھی ہے مشکوک لطف بھی موہوم
ہے میری تو یہ بھی قصدِ گناہ کی صورت
ترا گناہ بھی موہوم قصد بھی معصوم
حیات و موت ہے تفریح سادگی کو تری
مری حیات بھی افسردہ موت بھی مغموم
کچھ اس طرح ہے تری شوخیٔ میں آمدِ گل
پسِ غبارِ شفق جیسے فوجِ ماہ و نجوم

کھبی ہیں دل میں وہ سادہ نگاہیاں تیری
نظر میں گھوم رہی ہے وہ شوخی معصوم

تو ہی ہے درد تو دل کا علاج نا منظور
تو ہی دوا ہے تو دل کی شفا ہے نامعلوم

تری نگاہ میں اپنا مقام کیا ڈھونڈوں
نہیں ہے خود بھی مجھے اپنی حیثیت معلوم

معاف کر میں اگر دل کی بات کہہ نہ سکوں
نہیں ہیں راس محبت کو اس جہاں کے رسوم

ترا تپاک بھی ہے دل کی مصلحت کے خلاف
ترے نثار تو میکش کی نظم سن کے نہ جھوم

1943

قحطِ بنگال پر

کیا خبر تھی کہ تری زُلف کا قاتل خم و پیچ
بن کے زنجیر گلے میں ترے پڑ جائے گا
کیا خبر تھی کہ ترے حسن کا کافر جادو
بھوک بن کر ترا روئے نمکیں کھائے گا
کیا خبر تھی کہ تری آنکھ کا بدمست خمار
بن کے افلاس ترے جسم پہ چھا جائے گا
کیا خبر تھی کہ تری مانگ کا رنگین گلال
برق بن کر ترے خرمن کو جلا جائے گا
کیا خبر تھی کہ ترا ہمدم و دمساز و ندیم
آستیں میں تری رہ کر تجھے ڈس جائے گا
کیا خبر تھی کہ تری جاں کا محافظ تجھ کو
مثلِ یوسف سرِ بازار ہی بکوائے گا

2865

کام لے ہمتِ مردانہ سے اے غیرتِ شرق
جزر جسم کے دھارے میں قمر بھی ترا بہہ جائے گا
انقلابی علم لے کے وہ آتا ہے وہ دیکھ
مینارے منشار پہ جھنڈا ترا لہرائے گا

1943

عذریات

میں نہ آیا جو عیادت کو تری اے نسریں
نہ سمجھنا کہ مرے دل میں ترا درد نہیں
سر میں سودا ہے وہی تیری نگاہوں کی قسم
دل میں ویسی ہی کھٹک ہے تری پلکوں کی قسم
بجلیاں میرے لبوں میں ہیں تبسم سے ترے
سنسناہٹ سی رگوں میں ہے تکلم سے ترے
وہ نگاہوں کا تری ساز بھری محفل میں
اب بھی انگڑائیاں لیتی ہے جوانی دل میں
اب بھی سونے نہیں دیتا تری سانسوں کا خیال
لپٹا رہتا ہے بدن سے تری بانہوں کا خیال
خار ناخن ہے مجھے اب بھی ترے لمس کا پھول
اب بھی ہے حسرت آغوش مرا شوق فضول

ہاں مگر میں کہ ہوں بدنام محبت نسریں
ہاں مگر میں کہ ہوں ناکام محبت نسریں
میری آنکھوں سے برستے ہیں ترے افسانے
کیوں کوئی میری نگاہوں سے تجھے پہچانے

مرہم و نشتر

پھول سے رُخ پہ زُلفیں برہم
سمٹیں دھندلی شامیں مدھم
مہکا مہکا جسم کا گلشن
بہکا بہکا چال کا عالم
لاج سے آنکھیں جھپکی جھپکی
کچھ کچھ نشتر کچھ کچھ مرہم
رنگیں رُخ معصوم نگاہیں
برگِ گل پہ جیسے شبنم
آہو نظریں سب سے وحشی
نشتر پلکیں سب کی ہمدم
سانسوں میں بوئے بادہ سی
ہلکی ہلکی مبہم مبہم

رخ پہ میری نظر سے سرخی
سانسیں میری بات سے برہم
کافر نظروں کو کیا سمجھوں
پل میں جنت پل میں جہنم
جس کی طرف دیکھے وہی موتی
جس سے نظر پھیرے وہی شبنم
سب کا حاصل بینائی یہ ہے
بکھرے سمٹے وہ کھوئے گئے ہم

دورِ جنگ

مجھے اس زمانے میں کیوں یاد آئیں
وہ شیریں تبسم وہ نیچی نگاہیں
زمانہ مصیبت میں کھویا ہوا ہے
کہاں مجھ کو ڈھونڈیں گی اُلفت کی راہیں
بجائے گل لالہ رنگیں ہیں خوں سے
وہ کہسار کی صبحیں گلشن کی شامیں
اڑاتے تھے جو آسمانوں سے پنچھی
نہیں اُن کو ملتیں زمیں پر پناہیں
جنھوں نے خدا کو نکالا تھا گھر سے
وہ بندوں سے اب مانگتے ہیں دعائیں
جہاں مٹ گیا آپ اپنے خرد سے
جنونِ محبت کہاں آزمائیں

272

اب اللہ ہی اللہ ہے اہلِ دل کا
جو دل پہ گزرتی ہے کس کو دکھائیں

1942

ایک نرس سے

اسی کی فرمائش پر

اس طرح پاس آ نہ ملاتی ہوئی نگاہ
اے موجِ بادہ! عصمتِ دل ہو گئی تباہ

تو جب سے آرزوئے دلِ زار ہو گئی
صحت کی آرزو مجھے دشوار ہو گئی

تجھ سے ہے کیفِ شورشِ عہدِ شباب میں
اک تو ہی واقعہ ہے زمانے کے خواب میں

یوں تو نے انقلاب کیا حادثات میں
جس طرح آفتاب نکل آئے رات میں

تو اے سفید پوش! مریضوں کے ہال میں
کوئی حسین روح ہے قبروں کے جال میں

یہ راگ جانگداز ہے یہ نغمہ بے پناہ
تیرے قدم کی چاپ مریضوں کی آہ آہ

اے بے خبر تجھے بھی کچھ اپنا شعور ہے
میٹھی نظر کے بعد دوا کیا ضرور ہے
بے ہاتھ تیرے ہاتھ میں دل بے قرار ہے
اس وقت میری نبض کا کیا اعتبار ہے
کیا دیکھتی ہے نبض مرے دل پہ کر نظر
گوہر کی جستجو ہے تو ساحل سے در گزر
اظہار عشق تجھ سے علالت میں کیا کروں
تمہید حشر عین قیامت میں کیا کروں
مجھ کو یقیں ہے میں ترا بیمار عشق ہوں
پہچانتی ہے اپنی نگاہوں کا تو فسوں
"روزالا" تیرا نام مکمل نہیں مگر
"شیریں" رہے گا اس سے غم عشق عمر بھر
ٹوٹا ہے میرا ہاتھ تو اب دل نہ توڑنا
مجھ سے نظر ملائی تو ہے منہ نہ موڑنا
عزت بھی میرے دل میں ہے اور تیری چاہ بھی
دل بھی مجھے خدا نے دیا ہے نگاہ بھی
سارے جہاں کا حسن ہے میری نگاہ میں
آ سب کو چھوڑ کر مرے دل کی پناہ میں۔

داستانِ محبت

وہ جس کے انتظار میں دل خون ہو چکا
آئی ہے داستانِ محبت نئی ہوئی

اس شان سے حجاب میں ہے مستور ہے وہ گل
جیسے شمیم دل میں کلی کے چھپی ہوئی

غماز چشم و دل ہے یہ جنبش نقاب کی
اس برف میں ہے آتشِ الفت دبی ہوئی

میرے تصورات کے عالم کی سیر کر
پھر دیکھ مجھ سے کون سی شے ہے چھپی ہوئی

تو نے زبانِ غیر پوچھا مزاجِ عشق
یہ تیری دوستی ہوئی یا دشمنی ہوئی

آ مجھ سے سیکھ قتلِ دل و دادِ اشتیاق
آ جا نقاب اُلٹ کے مجھے دیکھتی ہوئی

اُس آرزو سے کاش ترا دل بھی ہو دوچار
جس آرزو سے ہے مرے دل پر بنی ہوئی
تو نے قریب آ کے اسے پھر جلا دیا
"رکھی تھی دل میں شمع تمنا بجھی ہوئی"
کچھ کہہ سکے تو تو ہی مرے دل کا حال کہہ
آنے سے تیرے رنج بڑھایا خوشی ہوئی

1941

ٹوٹا ہوا تارا

پہلے تو لیا خود مرے بازو کا سہارا
پھر مُڑ کے نہ دیکھا مجھے ظالم نے دوبارا

وہ شرم سے پھولی ہوئی گالوں پہ شفق سی
آنکھوں میں چمکتا ہوا شوخی کا ستارا

ہلکا سا وہ دزدیدہ نگاہوں میں تبسم
جیسے شبِ مہتاب میں ٹوٹا ہوا تارا

پلکوں پہ ہے دل کی حرکت چال میں لغزش
رعنائی سنبھالے ہوئے ساری کا کنارا

ماتھے پہ شکن اور اداؤں میں لگاوٹ
اعراض کے پردے میں توجہ کا اشارا

بے آنکھ ملائے ہوئے وہ چشمِ عنایت
پلکوں پہ مچلتا ہوا مجبور نظارا

خوش کیف تھی کتنی تری دزدیدہ نگاہی
اب تک ترے اعراض کی تلخی ہے گوارا
تسکیں نہ ہوئی میری تباہی سے بھی آخر
دیکھا مجھے الفت کی نگاہوں سے دوبارا
جاتی ہے تو دے جاتی ہے پیغامِ محبت
آتی ہے تو کرتی ہے محبت سے کنارا

1939

مردِ قلندر

یکساں ہے مرا دل حرم و دیر میں خورسند
خود اپنا ہی بندہ ہوں میں خود اپنا خداوند
ہاں چھیڑ دے مطرب مری ہستی کا ترانہ
میں حسن کا مرکز ہوں دل عشق کی سوگند
وہ عشق نہیں ہوں کہ ہو آہوں میں مقید
وہ حسن نہیں ہوں کہ ہو جلووں میں نظر بند
ہوں لالۂ صحرا کی طرح خانماں بردوش
وہ سرو نہیں جو کسی گلشن کا ہو پابند
بے ہوش کے ہشیار ہوں بے جام کے سرشار
بے ہجر کے غمگین ہوں بے وصل کے خورسند
جس منزلِ عالی میں پر افشاں ہوں میں اس جا
دُنیا ہے نہ عقبا ہے نہ بندہ نہ خداوند

کیا دخل ہے زاہد کا مرے دل کے حرم میں
یہ قصر نہیں جنتِ فردوس کے مانند
آزاد ہے کونین سے وہ مردِ قلندر
میکش کو نہ دے تاج بخارا و سمرقند

معذرت

یقیں کیونکر نہ آئے مجھ کو آخر تیری اُلفت کا
کہ انساں ہنس تو دے صنعت سے لیکن رو نہیں سکتا

تو ہو جائے مری ممکن ہے ایسا ہو تو سکتا ہے
مگر مَیں بھی ترا ہو جاؤں ایسا ہو نہیں سکتا

تری خاطر سے اکثر مسکرا دیتا ہوں میں ورنہ
مرے دل میں جو نقدِ غم ہے اس کو کھو نہیں سکتا

اگر تو چاہے تو برباد کر سکتا ہوں میں دل کو
مگر اس دل میں اب تخمِ محبت بو نہیں سکتا

خدا را روک لے اپنی نگاہِ لطف کو ظالم
کہ میرے دل سے داغِ غم کو کوئی دھو نہیں سکتا

تری اُلجھن نہ بڑھ جائے کہیں میری محبت سے
کہ میں غم میں بھی رونے کی طرح سے رو نہیں سکتا

خلش دل میں نہیں ہے آرزو کی پھر بھی کیا کہیے
نہ جانے کیا ہے جو راتوں کو اکثر سو نہیں سکتا

رجز

اے ہم نفسو صبح ہوئی دھوم مچادو
پھولی وہ شفق فتنہ خونیں کو جگادو
انبار پہ لاشوں کے کرو رقصِ مسرت
دشمن کی زمیں خون سے گلزار بنادو
ہاں ڈال بھی دو ہاتھ گریبانِ فلک میں
سیاروں کو ٹکرا دو ستاروں کو گرادو
یہ شہر یہ مزدور کا سرمایہ باغی
شہروں کی حدیں توڑ کے صحرا میں ملادو
افسوس سمندر پہ بھی سرمایہ ہے حاکم
شعلہ نفسو آگ سمندر میں لگادو
آندھی سے جو بچ جائے وہ پانی میں کرو غرق
پانی سے جو بچ جائے تو بجلی سے جلادو
تعمیر کی بنیاد ہے تخریب پہ قائم
تخریب حقیقت ہے زمانے کو بتادو

موجِ طوفاں

آزاد و گرفتار و حیا پیشہ و بے باک
آنکھوں میں حیا دل میں محبت کے شرارے
وہ نازک و نرم آنکھ وہ نشتر سی نگاہیں
وہ پھول سے رخسار دہکتے ہوئے تارے
کچھ دیکھ کے شرمائی بھی شرما کے بھی دیکھا
پلکوں کے چھپا کے وہ کن انکھیوں سے نظارے
ملتی رہیں نظریں کبھی ترچھی کبھی سیدھی
چلتے رہے دل پہ کبھی نشتر کبھی آرے
آنکھوں میں وہ طوفاں کبھی رندی کبھی تقوا
بکھرائے کبھی اور کبھی بال سنوارے
بے ہاتھ اُٹھائے ہوئے انگڑائی کا عالم
طوفاں کی وہ موج جو پہونچی نہ کنارے

1938

رہبر

وہ آتے ہیں مسلمانوں کے رہبر
نہ طاقت ہے نہ ہمت ہے نہ ایماں
فسوں پروردۂ عقلِ فرنگی
سیاست زادۂ سرمایہ داراں
اسی منزل پہ یہ پیدا ہوئے ہیں
جہاں ٹکرائے ہیں انجیل وقرآں
ذرا کہوائیے حق بات ان سے
کریں گے تازہ یہ آئینِ مسلماں
نہ نکلیں عمر بھر کوٹھی سے اپنی
جو دیکھیں خواب میں بھی تیغِ عریاں
یہی ہیں رہبرانِ قومِ حیدر
یہی ہیں پیروِ فاروقِ ذیشاں
یہی ہیں گر مسلمانوں کے رہبر
ہے کافر جو رہے اب بھی مسلماں

ریاکاری

''خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں''
کہ بے دینی بھی اک فیشن ہے مذہب بھی ریاکاری

بنے بیٹھے ہیں سب معبود اپنے اپنے حلقوں میں
نمائش کا ہے تقویٰ اور تصنع کی ہے مے خواری

ہیں کیفیات بھی مسٹر کی داخل داب مجلس میں
مثالِ گریہ واعظ یہ ہنسنا بھی ہے مکاری

ضروری جان کر روتا ہے بیٹا مرگِ مادر پر
مگر سمجھا ہے اس کو بھی محرم کی عزا داری

ملی جمعیتِ خاطر بھی صوفی کو تو محفل میں
گویا اپنی خلوت میں جو گایا بھی تو ''درباری''

مٹے جاتے ہیں باہم عاشق و معشوق اُلفت میں
مگر اسٹیج پر جس طرح کرتے ہیں اداکاری

لیے پھرتا ہے شوقِ خود نمائی سر پہ شاعر کو
ابھی چلنا نہیں سیکھا ہے یہ فرزندِ بے کاری
خدا کا شکر بندی ہو گئے تنظیم کے مؤثر
کہ اب بے انجمن کرتا نہیں ہے کوئی غداری
اسی میں عافیت ہے کیجیے تعظیم مُلّا کی
اگرچہ شہر پر روشن ہے مُلّا کی سیہ کاری
اسی میں مصلحت ہے ماننے ہر حکم لیڈر کا
اگرچہ کھل چکی ہے قوم پر لیڈر کی غداری

سلام

مل گئے کل راستے میں اک معزز شہر کے
آ رہے تھے کر کے اربابِ حکومت کو سلام
مجھ سے فرمایا کہ گو تم ہو بہت قابل مگر
جو نہ آئے کام ایسی قابلیت کو سلام
سجدہ گاہِ اہلِ دل ہے یہ تمھارا آستاں
آسماں کرتا ہے جھک کر جس کی رفعت کو سلام
شہر میں تم دیکھتے ہو آدمی کوئی نہیں
کر لیا ہے کس لیے تم نے سیاست کو سلام
حاکمانِ شہر شاکی ہیں کہ تم ملتے نہیں
کبر سے کرتے نہیں اربابِ دولت کو سلام
ہو کے عالم دین کے چلتے ہو راہِ عقل پہ
ہو کے صوفی حلقۂ اہلِ طریقت کو سلام
یہ تمھاری وضع وصورت یہ تمھارے رنگ ڈھنگ
اک نہ اک دن تم کرو گے دین وملت کو سلام

سلسلہ اُن کی ہدایت کو جو پہونچا دین تک
کی گزارش میں نے بھی کر کے مروت کو سلام
مشفقِ من! شہر میں جب آدمی کوئی نہیں
آپ ہی کہیے نہ کر لوں کیوں سیاست کو سلام
جس میں حق سننے کی استعداد بھی باقی نہیں
ایسی باطل قوم کی باطل قیادت کو سلام
حاکموں سے جھوٹ بولو بیچ ڈالوں قوم کو
آپ کا منشا یہ ہے کرلوں شرافت کوسلام
خود لڑاؤں جاہلوں کو خود کروں تبلیغ امن
لوں حکومت سے خطاب ایسی سیاست کو سلام
مجھ کو اپنے نفس کی ذلت بھی ہے دل سے عزیز
غیر سے جو مانگئے ہر ایسی عزت کو سلام
جس کی پاپوشیں بنی ہوں مفلسوں کی کھال سے
دُور سے اس وارثِ قاروں کی دولت کو سلام
جس کے ہاتھوں سے ٹپکتا ہو شہیدوں کا لہو
سن رکھیں اہلِ حکومت اس حکومت کو سلام
رند ہی اچھا نہ دو ذوقِ ریاکاری مجھے
قید جو حلقے میں ہو ایسی طریقت کو سلام
دین بھی فطری ہے میرا عقل بھی فطری مری
ہو جو فطرت کے مخالف اس شریعت کو سلام
ناصحا جس دین دملت کے نمائندے ہیں آپ
میکش بے دین کا اُس دین دملت کو سلام

مشرق و مغرب

تو مغربی ہے اور رجعی ہے
میں مشرقی ہوں اور انقلابی
ظاہر خراب اور آباد باطن
معصوم دل اور آنکھیں شرابی
تیرا تحمل ہے کینہ آگیں
میرا تجمل حاضر جوابی
معراج میری کرب و بلا میں
اور تیرا کعبہ اپنی نوابی
ہے میرا مشرب اُلفت ہی اُلفت
اور تیرا مذہب نفرت آلی
میری تباہی تن کی تباہی
تیری خرابی جان کی خرابی

تو علتی ہے میں ملتی ہوں
تو ذاروینی میں بوترابی
تو مغربی ہے میں مشرقی ہوں
تو شپری ہے میں آفتابی
خونِ حسینؑ خونی کفن ہے
میکش نہ ہو پھر کیوں انقلابی

میری خصلت

وہ ابر ہوں کہ جو برسا ہو یا نہ برسا ہو
ابھی فضاؤں پہ چھایا ابھی کہیں بھی نہیں
بُرا تو لگتا ہے دل کو کہوں میں یا نہ کہوں
کہ جو نہ ہو متاثر وہ آدمی ہی نہیں
مگر قسم ہے مجھے تیرے حسنِ ظاہر کی
کہ میرے دل میں برائی کبھی رہی ہی نہیں
نہیں ہے کچھ مری خصلت یہ حسن سے مخصوص
دلِ تباہ میں میرے بدی کسی کی نہیں
مگر خدا نہ کرے جو ہو تو کسی سے خفا
کہ تیرے دل سے برائی کبھی گئی ہی نہیں

1937

جلوۂ حجاب

اچانک وہ بالائے بام آ گئی
مجھے سامنے پا کے گھبرا گئی
بچائی بہت مجھ سے لیکن نظر
بچاتے بچاتے بھی ٹکرا گئی
سنبھالی جو ساری ڈھلکتی ہوئی
تو رُخسار پہ زلف بل کھا گئی
ہر اک شے پہ ڈالی نظر بے سبب
مگر مجھ پہ اور پھر بھی تڑپا گئی
ہر اک شے سے آخر نظر پھیر لی
ہر اک سمت اُلٹ نظر آ گئی
دکھاتی رہی غیرت اپنی شان
محبت ہر انداز پہ چھا گئی

نگاہ محبت کی طالب ہے اور
نگاہ محبت کو ٹھکرا گئی
محبت کو تاب توجہ نہیں
نظر پھیر کر دل کو سمجھا گئی
بہت طرح سنبھلی مجھے دیکھ کر
بہت طرح آخر کو شرما گئی
میں دیکھا کیا یہ تو سب کچھ مگر
گئی اس ادا سے کہ تڑپا گئی

رُلانے کو تھا مجھ کو میرا جنوں
تری وحشتوں پہ ہنسی آ گئی
تو ہی اب کوئی اور رستہ بتا
طبیعت محبت سے اُکتا گئی

جمال راہنما

کھڑی ہوئی ہے سرِ شام ایک پیکرِ نور
سنہری جسم پہ ملبوس ارغوانی ہے
اک آفتاب ہے بالائے بامِ حسن طلوع
اک آفتاب لبِ بامِ آسمانی ہے
نگاہوں کے لیے سامان ہے تسلی کا
دلوں کے واسطے پیغامِ خوں فشانی ہے
ہوا پروں پہ لیے ہے شعاعِ زلف کا ہار
شفق کی گود میں مچلی ہوئی جوانی ہے
مرے خیال سے چھایا ہوا ہے نشۂ حسن
مری نگاہ سے مہکی ہوئی جوانی ہے

سبھی شہید ہیں کس سے مبارزت طلبی
مٹا دے دہر کو وہ تیری ناتوانی ہے

تجھے بھی حق نے دیا ہے جمالِ راہنما
مری بھی راستہ بھولی ہوئی جوانی ہے
تری شمیم سے مہکے مری سحر کا وجود
کہ تو زمین پہ تنزیلِ آسمانی ہے
سنوار دے مری دنیا کو آ کے تو ورنہ
مری طرف ہی نہ دیکھے تو مہربانی ہے

حشرِ وداع

آیا ہوں ریل پر اسے رخصت کے واسطے
کچھ کہہ سکوں نہ جس کی محبت کے واسطے
جس کی حریم قدس میں ذوقِ نظر گناہ
رخصت نظر کو دل میں نظر کا اثر گناہ
کرتا ہے فرض آگ میں جلنا حرام ہے
جلوہ حلال ذوقِ تماشا حرام ہے

کس طور سے گزارے ہیں دن میں نے اس کے ساتھ
بیٹھا ہوں سر جھکائے ہوئے ہاتھ پر ہے ہاتھ
وہ شوخ بھی ہنسی بھی میں خوش بھی اور اداس
اٹھی ادھر نگاہ ادھر گم ہوئے حواس
بے بات کی نگاہ سے رُخ پر ملال ہیں
بے قصد کی نگاہیں تو وہ اک حلال ہیں

ہر تن میں ایک شعلہ جوالہ بند ہے
جامِ بلور میں مئے دوسالہ بند ہے
خورشیدِ صبح جیسے سمندر کی قید میں
جس طرح چاند پردۂ ابرِ سفید میں
سینے میں دل زمیں پہ دھڑکتے ہوئے قدم
احساسِ اجنبی سے لرزتے ہوئے قدم
وہ یاس کی نظر وہ تبسم ملال کا
دیکھا مجھے جھکائی نظر اور پھر کہا
"جب چھوٹ جائے ریل یہ تب جائیے گا آپ
اچھا کبھی ہمارے بھی گھر آئیے گا آپ"

میکش کبھی جو ہوگا محبت میں اور ہوا
وہ سب مرے فسانے میں ہے موت کے سوا
برسوں سے اس نظر کو نہ پہچانتا تھا میں
کہتا تھا دل تو جھوٹ اسے جانتا تھا میں
طرزِ وداع حشر کو بیدار کر گئی
دیکھا کہ وہ مجھے ہی جہاں تک نظر گئی
1936

کشمکش

جو کوئی راہ میں یوں دن کے وقت لُٹ جائے
وہ کیا کرے غمِ دل کو اگر کہے بھی نہیں

وہ ایک برقِ تجلّی جو دل کے خرمن پر
نہ چاہے گرنا مگر بے گرے رہے بھی نہیں

گلال مانگ میں ان کی تپش مرے دل میں
وہ شمعیں ہیں جنھیں کوئی بجھا سکے بھی نہیں

لیا سلام نگاہوں کا یوں نگاہوں سے
کہ جانتے ہیں مجھے اور جانتے بھی نہیں

غرور اُن کا، مرے سوزِ تازہ دم کی کشش
وہ جا سکے بھی نہیں پاس آ سکے بھی نہیں

جمی ہوئی ہے زمیں پر نگاہ میرے قریب
وہ دیکھتے ہیں مجھے یوں کہ دیکھتے بھی نہیں

ہر اک نگاہ میں یہ سعیِ رائگاں اُن کی

کہ مجھ کو دیکھ بھی لیں اور نظر ملے بھی نہیں
اگر ہنسے تو ملائی نہ پھر نگہ مجھ سے
اگر نگاہ ملائی تو پھر ہنسے بھی نہیں
تڑپ رہی ہے رگ و پے میں اُن کے وہ بجلی
جلادے جو مری تمکیں کو اور گرے بھی نہیں
ز فرق تابہ قدم وہ پیام ہیں دونوں
جو کہہ سکے بھی نہیں اور چھپا سکے بھی نہیں
اس اتفاق کا انجام یہ ہے اے میکش
اگرچہ مر نہ سکے ہم مگر جئے بھی نہیں

بادۂ دوشینہ

بے خودی کا دور تھا جامِ جمالِ یار تھا
کیا بتاؤں میں وہاں ساقی تھا یا مے خوار تھا
رات مے نوشی سے میری بادہ خود سرشار تھا

ناز بلبل پہ کوئی بجز گل تر دیکھتا
میں نگاہیں پھیر لیتا جب وہ ہنس کر دیکھتا
رحم اس ظالم کو آساں تھا ستم دشوار تھا

وحشتیں میری پریشاں ان کو کرتی ہی رہیں
وہ سنوارا ہی کیے زلفیں بکھرتی ہی رہیں
وضع خود داری سے اپنی حسن خود بے زار تھا

302

میں بتا کر کھو گیا وہ کسمسا کر رہ گئے
گھور کر کچھ زیرِ لب کہہ کر لجا کر رہ گئے
حالتِ دل پوچھنے پر کس قدر اصرار تھا

وجہ ناراضی کی پرسش تھی قیامت ہوش پر
ہو گئے خاموش سر رکھ کر وہ میرے دوش پر
موج ہی غافل تھی ساحل ورنہ کب خود دار تھا

دونوں عشق میں مکمل دونوں اُلفت میں خراب
دونوں طوفاں میں سمندر دونوں مستی میں شراب
امتیازِ طالب و مطلوب کیا دشوار تھا

یاس کی ظلمت میں اے میکش توقع کھو گئی
میں یہ سمجھا تھا دوائے دردِ اُلفت ہو گئی
دل کو جب دیکھا تو ظالم اور بھی بیمار تھا

شام تنہائی

لگا لوں میں گلے سے تجھ کو آ اے شامِ تنہائی
سکوں آموزِ دل تو مجھ کو ہر صحبت میں یاد آئی
نمودِ حضرتِ وحدت سکونِ عالمِ کثرت
تری تمکین و یکتائی تری مستی و رعنائی
ادب آموزِ عاشق ہے ترا اندازِ خاموشی
ادا انگیزِ شاہد ہے ترا احساسِ یکتائی
تری اک موج ہے بحرِ جہاں کا شورِ طوفانی
تری اک آن ہے کون و مکاں کی بزم آرائی
پریشاں کردیا عشرت کو تیری یادِ ماضی نے
خدا جانے وہ محفل کیوں تری خلوت میں یاد آئی

1933

شیخ و رند

معتقد میں بھی ہوں تیرا شیخ اور اک میں ہی کیا
نقش ہے دُنیا کے دل پر تیرا زہد و اتقا
ہے سجود بے تصنع کی جبیں آئینہ دار
رونق شب زندہ داری روئے اقدس کی ضیا
معتبر تیری طہارت منتخر تیرا وجود
تیرا سینہ بے کدورت تیری طاعت بے ریا
واقفِ رازِ طریقت حامیِ دینِ متین
مشعلِ راہِ شریعت شمعِ بزمِ اجترا
وہ نمازِ ہفت گانہ کا عیاں چہرے پہ نور
وہ ریاضت کی تجلی تیری آنکھوں کی جلا
کافر و مومن کرامت کے ہیں تیرے معترف
حاضر و غائب ہیں تیرے کشف کے مدحت سرا

سجدہ کرتے ہیں تری چوکھٹ پہ محتاج و امیر
نام لیتے ہیں ترا تعظیم سے شاہ و گدا
گرچہ میں ناقل ہوں پھر بھی میری گستاخی معاف
کہہ رہا تھا راہ میں کل ایک رند بے نوا
عقل کی تمکیں مسلم عشق کی شورش کہاں
دیدۂ تقوی کہا و جلوۂ معنی کہا
"از سواد الوجہ فی الدارین اگر داری خبر
چشم بکشا وجمال کفر وفقر ما نگر"
(مغربی)

1932

؟

عجیب شخص سے میں آج روشناس ہوا
فراخ دل کو زمانے سے اس کے پاس ہوا
اگرچہ وضع میں کچھ صاحبِ صفا بھی نہیں

عیاں یہ شکل سے اُس کی کہ غم کی عادت ہے
نہاں یہ بات میں اُس کی کہ سب سے اُلفت ہے
عیاں نظر کا یہ اُس کی کہ آشنا بھی نہیں

لگے جو چپ تو سمجھوں کوئی کلام نہیں
کرے کلام تو پھر اس کا اختتام نہیں
نہیں سخن میں فصاحت تو بے مزا بھی نہیں

تلاش اُس کی بہت کچھ ہے نکتہ چینوں کو
کبھی تو سینکڑوں سجدے ہیں مہ جبینوں کو
کبھی اُٹھا کے نظر اُن کو دیکھتا بھی نہیں

نظر میں اس کی کوئی خویش ہے نہ بے گانہ
کوئی سمجھتا ہے زندیق کوئی دیوانہ
مگر خلاف کسی سے اسے ذرا بھی نہیں
کبھی یہ زورِ تصوف کہ فلسفی بسمل
کبھی یہ جوشِ طہارت کہ متقی قائل
کبھی یہ کفر کا عالم کہ کچھ خدا بھی نہیں
ہے منکر اس کا کوئی کوئی مانتا ہے اُسے
ہر ایک کو ہے یہ دعوا کہ جانتا ہے اُسے
مگر یہ شک بھی ہے دل میں کہ جانتا بھی نہیں
اگر چہ لوگ غمِ دل کو کم سمجھتے ہیں
مگر یہ دردِ محبت ہے ہم سمجھتے ہیں
مریض بھی ہے وہ اور طالب شفا بھی نہیں
کسی کا ذکر جو میکش سے یوں سنا میں نے
تو غور کر کے قیافے سے یہ کہا میں نے
نہیں جو تو تو یہ کوئی ترے سوا بھی نہیں

مشکلِ غم

ہو رہا ہے میری جانب حُسن کیوں مائل بہت
ہے مجھے آسانیوں میں غم کی یہ مشکل بہت

میں تو خود ہی ہوں شہید سوزِ غم ناکامِ غم
دیکھنے والے ہوئے جاتے ہیں کیوں بسمل بہت

میں اُسی کا ہوں خریدے جو مرا ناکام دل
ورنہ ہیں یوں تو جوانی کے مری سائل بہت

عادتاً دیتا ہوں ہر اُلفت کا اُلفت سے جواب
ورنہ وہ بسمل نہیں میں جس کے ہوں قاتل بہت

غرق ہوں میں خود تلاشِ قعرِ یم میں اے جنوں
ورنہ میری زندگی کے واسطے ساحل بہت

عشق کی جولانیوں کو دشت وحشت بھی ہے کم
حسن کی رنگینیوں کو ہوش کی محفل بہت

مانگئے دُنیا سے کیا دنیا کا یہ انجام ہے
اُس نے کھویا بھی بہت جس نے کیا حاصل بہت

بھیج دے یارب جہاں میں کوئی ہستی غم نواز
میری دُنیا دیکھتی ہے رنگِ آب و گل بہت

کوئی میکش سا بھی ہے دیوانہ دانش فروز
کم سہی دُنیا میں لیکن پھر بھی ہیں عاقل بہت

عذرِ عشق

کب تک ترے تبسم پیہم کا دوں جواب
اے حسن شوخ آو تبسم نما سے میں
اے دوست اب کہ تاب مسرت نہیں مجھے
کس طرح ہوں دو چار غم مدعا سے میں
یہ پاس وضع جانئے یا خوئے عہد زیست
ملتا ہوں سب سے روئے تبسم نما سے میں
گو دل میں کچھ نہ بھی ہو مگر ہر حسین کو
کرتا ہوں پیش کچھ نگہ آشنا سے میں
ہاں حکم ہو تو پھر تری خاطر سے ایک بار
عہد بہار زیست کو مانگوں خدا سے میں
وہ عہد زیست جب کہ نہ تھا جز سرور دل
حیراں نہ تھا نگاہ حقیقت نما سے میں

سن تو سہی سرودِ دل وجاں نہ کہہ مجھے
کیا یہ سرودِ غم کا ترے شعبدا نہیں
صورت نے میری تجھ کو دیا اضطرابِ شوق
مجھ سے یہ تیرا رازِ تبسم چھپا نہیں
خود اپنے دل میں سوچ لے مجھ سے خفا نہ ہو
میں تیرے دل کا راز ہوں تجھ سے خفا نہیں
رکھتا میں اور بھی تجھے کچھ دن فریب میں
لیکن فریب شیوۂ اہلِ صفا نہیں
ہو عشق و شاہدی کہ خدائی وبندگی
وہ کام کونسا ہے جو میں نے کیا نہیں
ہے ذرّہ ذرّہ میرے لیے جامِ مے بہ کیف
میکش ہوں کون ہے جو مجھے جانتا نہیں
رندی بھی کوئی زہد کے مانند سہل ہے
میں کچھ نہیں ہوں پھر بھی مجھے دیکھ کیا نہیں
''عنقا شکار کس نہ شود دام بازچیں''
میں رندِ پاکباز ہوں پہچانتا نہیں

تصادم

ہو گیا اک دشمنِ جاں سے تصادم آج پھر
زخمِ دل کتنا بچایا میں نے پھر بھی چھل گیا
موجِ بوئے گل کہیں آ جائے جیسے ناگہاں
اس طرح کیفِ محبت جان و دل پہ چھا گیا
وہ توجہ کی نگاہیں میرے دل کے واسطے
سانپ کے کاٹے ہوئے کو جیسے ساون کی ہوا
اس کا وہ تیر از کماں جستہ سا بے قابو سلام
وہ مرا پایا ہوا کھویا ہوا سا مدّعا
وہ نظر میں اُس کی لاکھوں سوءِ ظن یاس آفریں
میں ہر اک انداز سے سر تا پا عہدِ وفا
ہر تغافل اُس کا میری نا امیدی پہ دلیل
ہر تبسم اُس کا امیدوں کا میری خوں بہا

کفر و ایماں ایک مرکز پہ سمٹ کر آ گئے
بے نیازی کی نگاہوں میں وہ جلوہ ناز کا
ہر بہانے سے تبسم ہر بہانے سے نظر
اک ادا سے ہے تعلق اک نظر سے آشنا
اس کی طفلانہ ادائیں لے گئیں مجھ کو کہیں
یا مرا بچپن لباس نو بدل کر آ گیا
کیا مرے خواب محبت کی تو ہی تعبیر ہے
کیا مرے دل کی صداؤں کا مخاطب تو ہی تھا

محبوبۂ شفق

اے جانِ حسن روحِ چمن مرکزِ شباب
رہ جلوہ گر کہ تجھ پہ ہے جلوے کا تیرے حق
اس وقت ہے تجھی سے منور جہاں کی بزم
رخصت ہے دن بھی اور رخِ خورشید بھی ہے فق
تو نے کیا زمیں کو حریف آسمان کا
تو سرخ پوش اور ادھر احمریں شفق

کیوں جانیے شفق اسے اے بدرِ نیم شب
تو ہے زمیں پہ نور ترا آسمان پر
کیوں مانیے شفق اسے اے خندۂ بہار
تیرے لبوں کا عکس پڑا آسمان پر
یا آگئی زمین پہ محبوبۂ شفق
اور رختِ خواب چھوڑ دیا آسمان پر

فانوس احمریں میں ہے اک شمع ضو فشاں
ڈوبا شرابِ سرخ میں جام بلور ہے
زُلفِ سیہ پہ سرخی ملبوس کی یہ برق
بالائے طور جیسے تجلّی طور ہے
اے خوں بہائے جانِ شہیدانِ رنگ و بو
تیری نظر پہ خون کسی کا ضرور ہے

اس آتشیں شباب پہ یہ شعلہ گوں لباس
اے مہرِ نیمروز زمیں آج جل نہ جائے
جینے دے زاہدانِ کثیف المزاج کو
گرمی سے تیری سنگِ طہارت پگھل نہ جائے
مت چھیڑ دیکھ پردۂ سازِ مجاز کو
اے سحرِ نغمہ طبعِ حقائق بدل نہ جائے

اے برقِ خرمنِ دل وجاں شعلہ تن
باندھی ہے آج تو نے کمر امتحان پر
کیا فرض ہے کہ عالمِ ہستی خراب ہو
کیا فرض ہے کہ ظلم ہو سارے جہان پر
آئیں بھی اپنے ضبط کی طاقت کو دیکھ لوں
جلووں کا زور ٹوٹ پڑے میری جان پر

مقتضائے فطرت

ہے زمیں کا آسماں کی سمت یہ دامن دراز
پتیوں میں عشق کی ہے کوہ کی رفعت کا راز
کیف میں ہے بحر رقصاں چھیڑ کر موجوں کا ساز
چھا رہا ہے دو جہاں پہ بادۂ الفت کا رنگ

موج و ساحل میں ہے کتنا ربط باہم دیکھ لے
دیکھ لے ہاں اتصال مہر و شبنم دیکھ لے
میری آنکھوں سے ذرا اتحاد عالم دیکھ لے
تو بھی مجھ سے صلح کر لے چھوڑ دے فطرت سے جنگ

جیسے پاکیزہ ہوائیں تودۂ خاشاک پہ
جس طرح بارش کے موتی آسماں سے خاک پہ

تو بھی زلف عنبریں رکھ دے دل صد چاک پر
جرم ہے قانون اُلفت میں لحاظ نام و ننگ

فکر فردا چھوڑیئے فرصت غنیمت جانئے
پیش بینی ہی کو آغاز مصیبت جانئے
اعتماد اعمال پہ توفیق رحمت جانئے
زعم سے عصمت کے بجز معصیت کا دل پہ زنگ

برسات کا ایک دن

مرا خیال شناور ہے بحر قدرت میں
مرا وجود مسرت ہے قلب فطرت میں
جلیس خلوت دل آج کوہسار[1] میں ہے
انیس بستر غم دامن بہار میں ہے
یہ سبز سُرخ زمیں یہ ہرے بھرے میداں
یہ کوہ سُرخ یہ ابر سیہ کا بحر رواں
پہاڑ کی وہ بلندی یہ پستی وادی
وہ اُس کے حسن کی نخوت یہ عاجزی میری
یہ برج کوہ کے دامن میں ہیں شکستہ سے
کہ سانحات گزشتہ ہیں عہد اُلفت کے
شکستگی میں نشان کمال باقی ہے
مٹے ہوؤں میں کسی کا خیال باقی ہے

---

1 مالپورہ۔ راجستھان کا ایک قصبہ

نمود ہے لبِ تالاب یوں درختوں کی
قطار دیدۂ پُرنم پہ جیسے پلکوں کی
ہوا کے زور سے پانی میں موجہائے حسیں
مری نگاہِ محبت پہ اس کی چینِ جبیں
وہ جھاڑیوں میں ہوئی گم دراز پگ ڈنڈی
سکونِ یاس میں جس طرح آرزو دل کی
کوئی حریف نہ ہو وہم اس تلاش میں ہے
یہ راستے کا خم و پیچ کس تلاش میں ہے
وہ سامنے کی پہاڑی پہ کھیلتی ہے گھٹا
ڈھکے ہوئے ہیں سیاہی سے وادی و صحرا
اسی طرح نگہ لطف دل پہ چھاتی ہے
اسی ادا سے محبت فریب کھاتی ہے
ہے جس کے واسطے دامن کشادہ یوں وادی
کسے خبر یہ گھٹا شام کو کہاں ہوگی
مثالِ عشق ہے وادی کا عزم واستقلال
بسانِ حسن ہے ماشی گھٹا کا استقبال
وہ گرد و پیش فضاؤں پہ چھا گیا بادل
سیاہ پردے میں مستور ہوگیا جنگل
وہ برق چمکی یہ مینھ زور سے برسنے لگا
جہاں نشیب تھا پانی وہیں چمکنے لگا

یہ پستیوں کی چمک ہے یہ پستیوں کا فراز
زمیں وہ تشنہ رہی تھا جسے فراز پہ ناز

ہوا کے ساتھ فضا میں پھسل رہی ہے نظر
تجلیوں کی وہ کثرت کہ تیزی ہے نظر
تقاضہائے حقیقت کہ مجھ کو پہچانو
تمنہائے لطافت کہ مجھ میں مل جاؤ
یہ وقت وہ ہے کہ جس میں نہ شام ہے نہ سحر
یہ وقت وہ ہے کہ تسکین دل کو ہے نشتر
چلی ہوا تو گل زخم غم مہکنے لگا
ملی دماغ کو راحت تو دل دھڑکنے لگا
بھلا رہا تھا میں جس کو وہ یاد آ ہی گیا
جھلک دکھا کے تصور میں مسکرا ہی گیا

1931

خودبینی[1]

غو صہبائے گوش شورِ ہاؤ ہو پرنگ کر
پردہائے چشم نذرِ جلوۂ بیرنگ کر
نغمہ ہائے معرفت سے دل کو ہم آہنگ کر
آپ سے بیگانہ رہنا ہی ہے اصل اختلاف

عیش ہائے وصل میں تمہید غمہائے فراق
خلوتِ جاں کو مت کر صرفِ بزمِ اشتیاق
اجتماعِ بزم کے معنی ہیں تجدیدِ نفاق
اتفاق اے مہرباں خود ہے بنائے اختلاف

کس کو کرتا ہے مخاطب کچھ تجھے معلوم ہے
قوم کہتا ہے جسے اُس کا تو ہی مفہوم ہے

---

1 یہاں سے سیکڑوں کی نظموں کا انتخاب ہے۔

یعنی ہے افراد کے مجموعہ خود معدوم ہے
عیب جوئی چھوڑ دے کر پہلے اپنا انکشاف

دوسرے کیوں جوش میں ہیں اس پہ تجھ کو جوش ہے
ہوش کی دیتا ہے دعوت اور خود بیہوش ہے
تو اگر خاموش ہوجائے جہاں خاموش ہے
اختلافوں کو مٹانا بھی تو خود ہے اختلاف

ضد سے ہے عرفانِ شے اے دوست یا تحصیلِ شے
کس طرح تنقیصِ شے سے ہوسکے تکمیلِ شے
جمعِ شے مقصد ہے اور تحت عمل تحلیلِ شے
کیوں تلاشِ امن میں رہتا ہے مصروفِ مصاف

تجھ میں پنہاں ہے حقیقت اور تو دیوانہ وار
ہے تلاشِ مشک میں مانند آہوئے تتار
غیر بینی چھوڑ خود بینی بنا اپنا شعار
آئینہ مت ڈھونڈ کر لے قلب کا آئینہ صاف
1930

صبح

اُٹھا غبار اُفق سے وہ آیا سوارِ صبح
فوجِ شعاع لیکے بڑھا تاجدارِ صبح
ہنس کر طیورِ صبح سے بولی بہارِ صبح
نغموں کے ہار کیجیے نذرِ نگارِ صبح
کشتیِ گل پہ لیکے کٹورا گلاب کا
شبنم چلی دھلانے کو منہ آفتاب کا

نکلی ہے یوں شعاع اُفق کے حجاب سے
جیسے کوئی حسیں ابھی چونکا ہو خواب سے
ضو کا فریب دُور کیا ماہتاب سے
دیکھا ہر اک طرف نگہِ فتحیاب سے
ہر ذرّے کو سبق دیا اللہ نور کا
دے دے کے حس بنایا مکلّف ظہور کا

بیداری ہوا میں ہے عالم خمار کا
پیدا ہوا ہمیں سے مزا انتظار کا
آئینہ ہے فلک چمن زر نگار کا
ہر قطرہ آفتاب ہو جوئبار کا
ممتاز کر کے فاصلے نزدیک و دور کے
انعام بٹ رہے ہیں نگاہوں کو نور کے

جنگل بسا ہوا ہے ہوا عطر بار ہے
سبزہ حریف نافۂ مشکِ تتار ہے
پانی کی لہر گیسوئے عنبر فشار ہے
طالع ہوئی سحر کہ طلوعِ بہار ہے
جوشِ جنوں میں دامنِ شب تار تار ہے
شامل بہار صبح میں صبحِ بہار ہے

طوفانِ ضو ہے بحرِ تجلی میں جوش ہے
ہر موج نور برقِ تحیر بہ دوش ہے
اب حسنِ محوِ خواب کو احساسِ ہوش ہے
انجامِ دل سمجھ کے محبت خموش ہے
ہوتا ہے حکم جلوۂ حیرت پناہ سے
دیکھے کوئی نگاہ ملا کر نگاہ سے

یہ صبحِ صبحِ روزِ ازل کا ظہور ہے
ہر اک شعاع حاملِ صد برقِ طور ہے
ایک ایک ذرہ معنیٔ اللہ نور ہے
سمجھیں نہ ہم تو فہم کا اپنے قصور ہے

پردہ اُلٹ کے دیکھ تو شب کی نقاب کا
سارا جہاں ظہور ہے اک آفتاب کا

ہر ذرّے کو یقین کہ میں آفتاب ہوں
شرمندہ آفتاب کہ میں خود حجاب ہوں
ہے مدعی سراب کہ میں عین آب ہوں
اور منفعل ہے آب کہ میں بھی سراب ہوں

بے کار ہے یقیں کی طلب عقلِ خام سے
یاں امتیاز صبح کا ہوتا ہے شام سے

عشق و ہوس

ترا سب کچھ یہی دنیا ہے میرا کیا ہے دنیا میں
مجھے جانا ہے دُنیا سے تجھے رہنا ہے دُنیا میں
حقیقت کا میں جویا اور تو منکر حقیقت کا
جو خود دشمن ہو اپنا اس سے کیا موقع شکایت کا
جو پابند ہوس ہو راز کیا سمجھے محبت کا
ہوس کی قید سے بالا ہے معیار اپنی اُلفت کا
تری حد نظر شاہد فروشی کی دوکاں تک ہے
مری پرواز کی وسعت مکاں سے لامکاں تک ہے
میں ہو پردے کے اندر اور تو پردے کو تکتا ہے
ہے لیلیٰ میرا مقصد اور تجھے محمل پہ تکتا ہے
جو شاہد ہیں زمانے کے مری عصمت کے شاہد ہیں
جو مسجودِ زمانہ ہیں وہ میرے در پہ ساجد ہیں

ستاروں تک نظر تیری میں خود خورشید خاور ہوں
اگر تیرے برابر ہوں تو کافر کے برابر ہوں
ہوس معبود تیرا اور مرا مقصود ناکامی
تجھے لذت بُرا کہتے ہیں مجھ کو ذوقِ بدنامی
مری بدنامیوں میں ہیں مری آزادیاں پنہاں
مری ناکامیوں میں ہیں مری خود داریاں پنہاں
تری معراج بدگوئی مری تمکین خاموشی
ہے تیرا افترا شیوہ مری عادت خطا پوشی
علاج اپنی برائی کا سمجھتا ہے تو بدگوئی
بھلا تو کب ہوا گر ہو گیا ثابت بُرا کوئی

تکبر تیری عزت ہے تواضع میری عزت ہے
تری رفعت میں پستی ہے مری پستی میں رفعت ہے
وہ کیا عزت ہے جو حاصل ہو دنیا کی مذلت سے
وہ جلب نفع کی خاطر ہو یا خوف مضرت سے
وہ کیا عزت ہے دیکھیں جس کو اہل حق حقارت سے
وہ کیا عزت ہے سمجھے جس کو دنیا اپنی نسبت سے

مری عزت عمل سے ہے مری عظمت ہے محنت میں
مری قوت ہے تقوے سے مری زینت مصیبت میں
مقامِ عشق میں دار ورسن معراج ہے مجھ کو
میں شاہِ دل ہوں طعن اہلِ دنیا تاج ہے مجھ کو

مجھے غلطیدگی خاک وخوں ہی شان وشوکت ہے
مجھے گلکاری دستِ جنوں ہے زیب وزینت ہے

نہ بڑھ جاتی ہے مجھ میں کوئی شے دُنیا کی عزت سے
نہ ہو جاتا ہے کم کچھ اہلِ ظلمت کی مذلت سے
حقیقت بے نیازِ این وآں ہے این وآں کیا ہے
حقیقت بے نیازِ دو جہاں ہے دو جہاں کیا ہے

مجھے آتا نہیں ہے حال بے معنی سلاموں پر
مکیف میں نہیں محفل میں اُنگلی کے اشاروں پر
نہ مجھ کو دعویٰ علمی نہ مجھ کو لافِ عرفانی
نہ کاکل زینتِ تقویٰ نہ تسبیح سلیمانی
ہے میرا اعترافِ جہل دانائی حقیقت میں
غرورِ بے گناہی ہے گنہگاری محبت میں
جھڑادے اہلِ حاجت سے مرے در کی زمیں بوسی
حسد سے ہو تجھے تسکیں مجھے غم سے سبکدوشی
میں قیدِ رسم سے آزاد ہوں یہ ہے مرا مسلک
میں باطل کے لیے جلاد ہوں یہ ہے مرا مسلک
تو بد ہے میں مگر تیری بدی سے بھی نہیں ڈرتا
جو ڈرتا ہے خدا سے وہ کسی سے بھی نہیں ڈرتا
مکمل اپنی آزادی میں ہو کر عین فطرت ہوں
سمجھ کر مجھ کو کچھ کہنا کہ میں تیری حقیقت ہوں
1929

ازراہِ محبت

سُن اے فریب خوردۂ یک کیفِ دلبری
کہتا ہوں میں یہ تجھ سے محبت کی راہ سے
میں شاہدِ حقیقتِ حسنِ مجاز ہوں
چاہوں تو لاکھ حسن بنادوں نگاہ سے
واقف ہوں میں جہان کے کیف و مزاج سے
چاہوں تو دو جہاں کو مٹادوں اک آہ سے
ہوجائے ایک دم میں فنائے تعینات
منہ پھیرلوں اگر میں تخیل کی راہ سے
حسنِ خیال کی یہ مرے سب نمود ہے
تیرا وجود ہے مرے کیفِ نگاہ سے
مجروِ نیازِ عشق فقط ایک شغل ہے
کچھ ربط ہوگیا ہے مجھے سوزِ آہ سے

334

میں ہوں شہید شاہدِ بزمِ تجلیات
سن میرا مرثیہ شفقِ صبحگاہ سے
تجھ سے مرا معاملہ اس سے فزوں نہیں
اپنے کو دیکھتا ہوں میں تیری نگاہ سے
اس بات کا جواب ہے کل بزمِ غیر میں
مجھ سے کہی تھی تو نے جو نیچی نگاہ سے

1927

جب دلِ نہ آیا تھا

ازل سے گو حسینوں کی محبت میری فطرت تھی
مگر فطرت ابھی ناواقفِ سوزِ محبت تھی
دلِ معصوم کو میرے ہر اک کافر سے اُلفت تھی
نہ تھا تکلیف کا احساس کیا اچھی طبیعت تھی
مری شرکت موقر تھی ہر اک معصوم صحبت میں
مسلّم میری بے لوثی حسینوں کی جماعت میں
مری عصمت کی قسمیں معتبر اہلِ محبت میں
مری پُرسوز آہیں منتظر بابِ اجابت میں

سمجھتا تھا نہ کچھ معنی میں دزدیدہ نگاہوں سے
گماں کرتا نہ تھا کچھ بھی کسی کی سرد آہوں سے
نہ تھا واقف لگاوٹ کی میں ان پیچیدہ راہوں سے
نہ نکلا تھا کبھی باہر خرد کی درس گاہوں سے

نہ دیکھا تھا کسی کا بن کے زلفیں کھول کر آنا
نہ دیکھا تھا کسی کا آہ بھر کر جان سے جانا
نہ تھا معلوم کیا ہوتا ہے دل لے کر مکر جانا
نہ تھا معلوم ہو جاتا ہے کیسے کوئی دیوانا

نہ تھا معلوم دل جاتا ہے اک چشمِ عنایت میں
نہ تھا معلوم اُلفت کی سزا ملتی ہے فرقت میں
نہ تھا معلوم دل کو عیب لگ جاتا ہے اُلفت میں
نظر بدنام ہو جاتی ہے پاکیزہ محبت میں

خبر کیا تھی مجھے اُلفت میں مرجانا بھی ہوتا ہے
جو کرتے ہیں محبت اُن سے شرمانا بھی ہوتا ہے
خبر کیا تھی مجھے جینے میں غم کھانا بھی ہوتا ہے
ضروری آنے والے کے لیے جانا بھی ہوتا ہے
نہ سمجھا تھا کہ دل لیکر کوئی ناراض ہوتا ہے
نہ سمجھا تھا کہ دل دیکر کوئی کمبخت روتا ہے
کسی کے پاؤں پر سر رکھ کے کوئی جان کھوتا ہے
کوئی ہم سے نہ بولے اب کوئی یہ کہہ کے سوتا ہے
ہوا کیا حال دل کا کیوں کسی انجان سے کہیے
توجہ ہو نہ دانا کی تو کیا نادان سے کہیے
نہ ہو جب داد کی حسرت تو کس ارمان سے کہیے
نہیں کیا آپ کو معلوم ہاں ایمان سے کہیے

1926

اسیر فرقت کی پہلی شام

پانی ابھی تھما ہے بادل ابھی کھلا ہے
ہے شام اور سورج ڈوبا ہی چاہتا ہے
مشرق سے اب سیاہی اٹھا ہی چاہتی ہے
محمل سے اپنے لیلیٰ نکلا ہی چاہتی ہے
خورشید ایک قطرہ ہے مائل چکیدن
پر سوز ویاس آگیں بیتاب جاں سپردن
گویا کہ سر سے پا تک حالت ہے میرے دل کی
نقشہ ہے میرے دل کا صورت ہے میرے دل کی
پانی میں ہے روانی دلدل میں خامشی ہے
سبزے میں ہے روانی جنگل میں خامشی ہے

طائر سکوت میں ہیں چوپائے چپ کھڑے ہیں
کیا میرے غم کے سب کے دل پر اثر پڑے ہیں

بیٹھا ہوا ہوں میں بھی اک پیڑ کے سہارے
غرقِ غمِ جدائی اک جھیل کے کنارے
شوخی میں ہیں ہوائیں لہریں مچل رہی ہیں
میں ہوں کہ میرے دل میں آہیں اُبل رہی ہیں
اب کے اگر لگے گا کوئی ہوا کا جھونکا
گھٹ جائے گا مرا دم صدمہ نہ ضبط ہوگا
اُلفت میں جب سے اُن کی میں مبتلا ہوا ہوں
یہ پہلی مرتبہ آج اُن سے جُدا ہوا ہوں

وہ رخصتی نگاہیں وہ شانِ اشتناقی
مایوسیوں کو دل کی وہ حکمِ اشتناعی
رُک رُک کر اُن کا چلنا اور چل کے ٹھہر جانا
پی پی کے آنسوؤں کو وہ اُن کا مُسکرانا
اب بھی وہی نظر میں میری سماں بندھا ہے
آنکھوں میں پھر رہا ہے بے چین کر رہا ہے
اب بھی اسی ادا سے وہ ٹل کے جا رہے ہیں
مُڑ مُڑ کے دیکھتے ہیں اور مُسکرا رہے ہیں

میکش ہے تم پہ شیدا کہنے سے کام کیا ہے
تم نے سمجھ لیا ہے میں نے سمجھ لیا ہے

میں پاک بازِ اُلفت دیوانہ فنا ہوں
مٹ [illegible] چاہتا تھا مٹنا ہی چاہتا ہوں

احوال سوزِ غم کا تم سے کبھی کہا ہے
اپنا ہی خوں پیا ہے اپنا ہی خوں کیا ہے
کس شے میں محو ہو تم مجھ پر نظر نہیں ہے
کیا چیز ہوں میں تم کو اپنی خبر نہیں ہے

پھر بھی ہے یہ تمنا پھر بھی یہ آرزو ہے
پھر بھی یہ مدّعا ہے پھر بھی یہ جستجو ہے
آجاؤ اک گھڑی کو آجاؤ ایک دم کو
لیجاؤ میری جاں کو گل کردو شمع غم کو
چشم کرم سے دیکھو زانو پہ سر کو رکھو
رہ جاؤں سرد ہو کر ایسی نظر سے دیکھو
کیوں طول دے رہے ہو افسانہ ہائے غم کو
یہ قصہ مختصر ہو آجاؤ ایک دم کو
1924

رباعیات

غفلت کی مسرّتوں سے حرماں بہتر
یاد آئے اگر خدا تو طوفاں بہتر
ہو جس سے غرور وہ عبادت عصیاں
توڑے جو خودی وہ کفر وعصیاں بہتر

اے عصمتِ محض! خوئے انسان میں آ
اے ساکنِ کنجِ علم! وجدان میں آ
ساحل ہی میں عافیت ہے لیکن کب تک
تو بحر ہے بے کنار طوفان میں آ

دُنیا کی ہر ایک شے کو چھانا تو نے
تسخیر کیا ہے اک زمانا تو نے

ہر شے سے زیادہ مستحق تھی تری ذات
افسوس اُسی کو کچھ نہ جانا تو نے

اے خالقِ نو بہار کچھ دیکھ کے چل
یہ سبزہ یہ لالہ زار کچھ دیکھ کے چل
غفلت سے بہے نہ جا خود اپنی رو میں
اے موجہ آبشار کچھ دیکھ کے چل

ہاں تیری خودی بھی فلسفی اچھی ہے
مستوں کی بھی خوئے حبشی اچھی ہے
عرفاں نہ ہو جس کو ذاتِ حق کا اس کی
اچھی ہے خودی نہ بے خودی اچھی ہے

داستانِ شب

یہ مَیکش اکبرآبادی کا تیسرا مجموعہ کلام ہے۔ اس کے دو اڈیشن ایک سال کے وقفے سے شائع ہوئے۔ طبع اول 1979 میں ہندوستان میں نامی پریس لکھنؤ سے شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں ایک نعت، چار منقبتیں، اڑتالیس غزلیں اور دیگر اشعار ہیں۔ اس مجموعہ میں 1955 سے لے کر 1977 تک کا کلام شامل ہے۔

مصنف کا مختصر تعارف

مصنف کا نسب اکتیس واسطوں سے امام جعفر صادق سے ملتا ہے ان کے جد بزرگ سید امجد علی شاہ اصغر متوفی 1230 کا دیوان اُردو فارسی مطبوعہ ہے ان کا ذکر نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اور اسپرنگر وغیرہ نے بڑے اہتمام سے کیا ہے ان کے صاحبزادے سید منور علی شاہ کو مہاراجہ سندھیا نے جاگیر عطا کی اور سند میں لکھا کہ شاہانِ سلف اس خاندان کی خدمت کرتے آئے ہیں اس لیے مجھ پر بھی آپ کی خدمت لازم ہے۔ سید منور علی شاہ صاحب کے صاحبزادے سید مظفر علی شاہ اللّٰہی ہندوستان کے مشہور صوفی تھے آپ کی تصنیف جواہر غیبی کئی بار نول کشور پریس سے شائع ہوئی۔ سید مظفر علی شاہ کے صاحبزادے سید اصغر علی شاہ تھے جو میکش کے والد تھے میکش کی پیدائش 1902 کی ہے 1919 میں جامع آگرہ سے انھوں نے درس نظامیہ کی سند تکمیل حاصل کی۔ انگریزی اور فارسی گھر پر پڑھی سات کتابیں تصنیف کیں۔ نغمہ اسلام، میکدۂ حرف تمنا، نقد اقبال، غوث الاعظم، مسائل تصوف، شرک و توحید، پچاس سے زیادہ مضامین نثر میں مختلف رسائل میں لکھے اور ریڈیو سے نشر ہوئے۔ مولانا حامد حسن قادری، نیاز فتح پوری، آل احمد سرور، نواب جعفر علی خاں اثر، ڈاکٹر محمد حسن وغیرہ نے کتابوں پر غیر معمولی تبصرے کیے، حرف تمنا اور نقد اقبال پر بھارت گورنمنٹ نے انعام دیا۔ مسائل تصوف پر اُردو

اکاڈمی لکھنو نے پانچ ہزار کا خصوصی انعام دے کر عزت افزائی کی۔ داستانِ شب، حرفِ تمنا کے بعد کا کلام ہے۔

آنکھوں میں نمی دلوں میں یادیں
ہیں صبح کو داستانِ شب ہم
کچھ سمجھا کسی نے کچھ کسی نے
ہیں کس کا پیام زیرِ لب ہم

نعت و منقبت

ہُوالاول ہُوالآخر کے معنی ہم یہ سمجھے ہیں
خدا کا جلوۂ تخلی ہے تیرے روئے روشن میں
زمانہ بیخود و سرشار ہے آواز سے تیری
اَذانِ کعبہ کے نغمے ہیں ناقوسِ برہمن میں
تو ہی ہے حسن میں شوخی تو ہی ہے عشق میں گرمی
تری شورش ہے موسیٰ میں ترا جلوہ ہے ایمن میں

نبی جلالِ خدا ہیں علی کمالِ خودی
علی جمالِ نبی ہیں زہے جمالِ نبی

علی مکین و مکاں ہیں علی زمین و زماں
علی عیان و نہاں ہیں علی خفی و جلی

یہ قید نام و نشاں لاالٰہ الااللہ
یہاں علیؑ ہی علیؑ ہیں وہاں علیؑ ہی علی

علیؑ حسینؑ کے والد علی بتول کے زوج
علیؑ نبی کے وصی ہیں علیؑ خدا کے ولی

علیؑ وہ شیر الٰہی ملوکیت دشمن
جلا نہ عہد میں جس کے چراغ بادشہی

علیؑ کا فقر ہے تیغ و جہاد و فکر و عمل
علیؑ کا فقر نہیں ہاؤ ہوئے خانقہی

علیؑ کا علم ہے جذب و سرور و وجد و حضور
علیؑ کا علم نہیں بحث شیعی و سنی

سلامِ عشق تجھے اے بہار غم بنی
ترے نثار مرے اشکِ خوں کی رنگینی

وہ تیرا حلق بریدہ جمالِ خود داری
وہ تیرا سجدۂ آخر کمال خود بینی

وہ تیرے ٹوٹے ہوئے بازوؤں کا رُعب وجلال
لرز رہی ہے کھڑی دور فوج بے دینی

حسین کیسے زمانے سے ساز کر سکتے
کبھی ہوئی ہے محبت سے مصلحت بینی

تمام دولت وشاہی تمام فوج وسپاہ
دبا نہ ساری خدائی سے ضعف مسکینی

ہیں مضطرب ترے ماتم میں مشرق ومغرب
تڑپ رہے ہیں ترے غم میں ترکی وچینی

ہے تیرے خوں سے خدوخالِ حسن میں گرمی
ہے تیرے خوں سے محبت کے غم میں رنگینی

غلام اس کا ہوں میکش کہ جمع ہیں جس میں
خدا وبندۂ وخود بینی وخدا بینی

حسینؑ شانِ کمالِ محمدؐ عربی
نبی جمالِ الٰہی ہیں وہ جمالِ نبی
حسینؑ جلوۂ مطلق حسینؑ عرش مقام
حسینؑ روحِ الٰہی حسینؑ سرِّ نبی
حسینؑ جس کے سبب کج ہے بیکسوں کی کلاہ
حسینؑ جس سے ہوئی آبروئے تشنہ لبی

جو تیری طرح مثیلِ حق پہ وہ ہیں تیرے غلام
وگرنہ کیا ہے ترے غم میں آہ نیم شبی
قتیلِ خنجرِ لا ہے فنائے ذات سے تو
ترے حضور میں ہستی کا ہوش بے ادبی
کسی شقی کی اہانت سے کیا ہوا منیش
کہ بوسہ گاہ نبی کی ہے بوسہ گاہِ نبی

درمدحِ مُرشدِ خودگوید

اے چارۂ ہر مبتلا حضرت سراج السالکینؒ 1
مشکل کشا مشکل کشا حضرت سراج السالکین

ہیں جمع ذات پاک میں جملہ کمالات علوم
اے مظہرِ ذاتِ خُدا حضرت سراج السالکین

چھایا ہوا ہر آن وہ الفقر فخری کا سماں
اے عین تاج الاولیاء حضرت سراج السالکین

اے وارث علم نبی اے واقفِ رازِ علی
ابن علی مرتضیٰ حضرت سراج السالکین

---

1 سراج السالکین لقب ہے حضرت شاہ محی الدین احمد عرف حضرت ننھے میاں صاحب جو حضرت نیازؔ بے نیاز شاہ نیاز احمد بریلوی کے نبیرہ تھے۔

جو چیز کی جس نے طلب بخشی وہ اس کو بے سبب
ابر کرم بحر سخا حضرت سراج السالکین

اے عین حق عین نبی عین علی مرتضیٰ
سنیے مری فریاد یا حضرت سراج السالکین

وضع کا پاس کہاں تک کرتے ہم تو پھر دیوانے تھے
ان سے بھی یاں نبھ نہ سکی جو عاقل تھے فرزانے تھے
آپ یہ طے کرتے رہیے کچھ تھا کہ نہ تھا کچھ ہے کہ نہیں
کٹ ہی گئی اپنی تو ان میں خواب تھے یا افسانے تھے
موج صبا سے اس نے چھیڑا بوئے گل سے یاد کیا
ہم بدقسمت پھر بھی نہ سمجھے کہنے کو فرزانے تھے
اگلی پچھلی باتوں کا کیا ذکر ہے اب جانے دیجے
آپ کے در پر آ ہی پڑے ہم تھے جب تک بیگانے تھے
رات کو ان کی خلوت میں خود ان کے سوا کوئی بھی نہ تھا
صبح ہوئی تو سب کے لبوں پر میرے ہی افسانے تھے
مغروروں کو دیکھ کے ہم نے یہ سیکھا ہے اے میکش
جس سے ملے اس طرح ملے جیسے جانے پہچانے تھے
1955

مرے غم کے لیے اس بزم میں فرصت کہاں پیدا
یہاں تو ہو رہی ہے داستاں سے داستاں پیدا

مری عمریں سمٹ آئی ہیں ان کے ایک لمحے میں
بڑی مدت میں ہوتی ہے یہ عمرِ جاوداں پیدا
یہ اپنا اپنا مسلک ہے یہ اپنی اپنی فطرت ہے
جلاؤ آشیاں تم ہم کریں گے آشیاں پیدا
تو اپنا کارواں لے چل نہ کر غم میرے ذروں کا
انھیں ذروں سے ہوجائے گا پھر اک کارواں پیدا
ہماری سخت جانی سے ہوا شل ہاتھ قاتل کا
سرِ مقتل ہی ہم نے کرلیا دار الاماں پیدا
وہی ہے ایک مستی سی وہاں نظروں میں یاں دل میں
وہی ہے ایک شورش سی وہاں پنہاں یہاں پیدا
ذرا تم نے نظر پھیری کہ جیسے کچھ نہ تھا دل میں
ذرا تم مسکرائے ہوگیا پھر اک جہاں پیدا
توقع ہے کہ بدلے گا زمانہ لیکن اے میکش
زمانہ ہے یہی تو ہوچکے انسان یاں پیدا
1955

اُن کے جلووں ہی میں ہو صرف جو اے سوز دڑوں
کیا ملے گا مرے چہرے سے نمایاں ہوکر

اَب اندھیرا ہی اندھیرا ہے زمانے بھر میں
کیا ہوا یہ تری محفل میں چراغاں ہوکر

ضبط نے دل میں لگائی تھی جو اک مدت میں
وہ گرہ کھول دی زلفوں نے پریشاں ہوکر

اب جہاں چاہوں بنالوں میں گھر اپنا حیکش
بڑھ گئی اور بھی وسعت مری ویراں ہوکر

1956

سخن کو شمع و گل و لالہ زار میں نے کیا
بہار آئی جو ذکر بہار میں نے کیا
سما گیا دلِ ہستی میں تیرا غم لے کر
خزاں کو موجِ نسیم بہار میں نے کیا
نہیں خود اپنی ہی ہستی کا اعتبار مجھے
یہ جان کر بھی ترا اعتبار میں نے کیا
بنایا عرضِ محبت کو ایک فن میں نے
جنوں کو شمعِ سرِ رہگزار میں نے کیا
یہ حال کیا ہے کہ آغوش میں تجھے لے کر
تمام عمر ترا انتظار میں نے کیا
یقیں ہوا نہ انھیں میرے ترکِ الفت کا
اگرچہ جرم یہ کتنی ہی بار میں نے کیا
بنایا تو   تمنا کو میرے دل کا چراغ
چراغ   ب ہائے تار میں نے کیا

تمھارے طرزِ تبسم کو وعدہ میں نے کہا
تمھارے وعدے کا پھر اعتبار میں نے کیا
نہ بن پڑی تمھیں مجھ سے نظر ملائے بغیر
تمھارے تیر کو آخر شکار میں نے کیا
تلاشِ بالش سر بھی ہے دردِ سر میکش
خود اپنے سر ہی کو زانوئے یار میں نے کیا
1957

شعر

بڑھائی دید کی لذت مرے وہمِ جدائی نے
رہے وہ سامنے یوں جیسے کوئی بار بار آئے

حاصل یقیں بھی ہے کفر آشنا بھی ہے
عشق بولہب بھی ہے عشق مصطفیٰ بھی ہے
اب زمانہ سازی کا یاں دماغ ہے کس کو
ورنہ چاک پیراہن بارہا سیا بھی ہے
دل کو بھائے جاتی ہے ایک اک ادا اُن کی
یارب اس محبت کی کوئی انتہا بھی ہے
خونِ آرزو کرکے جارہے ہیں وہ لیکن
اُن اداس آنکھوں میں ایک التجا بھی ہے

اور کون جانے گا تیری بزم کے آداب
میں نے دل دیا بھی ہے میں نے دل لیا بھی ہے
ایک رنگ آتا ہے ایک رنگ جاتا ہے
جیسے ان کی خلوت میں کوئی دوسرا بھی ہے
پھیرلی ہے جو مجھ سے آہ وہ نظر تیری
اس جفا کو کیا کہیے جو تری وفا بھی ہے
عاشقی کے فن ہیں یہ دیکھ کام میکش کے
بندہ بُتاں بھی ہے مردِ باخدا بھی ہے
1957

حسن ہے ساری ہستی میں رعنائی ہی رعنائی
یکساں ہے اک پھول کھلا یا ایک کلی کمہلائی
بادل جھومے سبزے لہکے مہک اٹھے گلزار
دل سے میرے لہر اٹھی یا زلف تری لہرائی
سوئے ہوئے طوفاں کو تم تو چھیڑ کے راہ لگے اپنی
اب یہ تم سے کون کہے کیا کشتی پر بن آئی
دنیا کو گلزار بنادوں چاہے لگادوں آگ
سب ہیں میرے دل کی زد میں کیا پربت کیا رائی
بت خانے سے کیا بنتی کعبے سے بھی رُوٹھ آئے
کس کس پر الزام رکھیں ہم خود ہی تھے ہر جائی
1957-1956

میں نے اس شعبدہ گر دل کو کہاں چھوڑ دیا
آپ کے مدِّ مقابل کو کہاں چھوڑ دیا
جستجو ہے تو مگر یاد نہیں کس کی ہے
ذوقِ رہگیر نے منزل کو کہاں چھوڑ دیا
وہ نظر تیری جو مجھ پر نہ تھی اور مجھ پر تھی
تُو نے اُس خلوتِ محفل کو کہاں چھوڑ دیا
یاں نہ امید کا گلشن ہے نہ ویرانہ یاس
بے خودی تو نے مرے دل کو کہاں چھوڑ دیا

1957

دُنیا کو تری باغِ ارم ہم نے کیا ہے
کیا کام محبت کی قسم ہم نے کیا ہے
ڈھائے ہیں تحمل سے محل ظلم کے ہم نے
گردن سے سرِ تیغ کو خم ہم نے کیا ہے
بُت خانے تری زُلف سے تعمیر کئے ہیں
ابرو کو تری طاقِ حرم ہم نے کیا ہے
گلہائے پریشاں پہ شہیدوں کا فسانہ
خونِ دلِ شبنم سے رقم ہم نے کیا ہے
ڈالا ہے دلِ شیخ وبرہمن میں ترا غم
کیا کام سرِ دیر و حرم ہم نے کیا ہے
غفلت ہی میں یہ عمر گزاری ہے مگر ہاں
چاہا نہ کسی کو ہو یہ کم ہم نے کیا ہے

کیا تیری شکایت کہ ستم ہے تری فطرت
اپنے پہ بھی اک عمر ستم ہم نے کیا ہے

1957

حاصلِ عشق غمِ دل کے سوا کچھ بھی نہیں
اور اگر ہے تو سب اُن کا ہے مرا کچھ بھی نہیں

جس پہ بنیاد تمنا کی رکھی ہے دل نے
ان کے اندازِ تخاطب کے سوا کچھ بھی نہیں

کردیا مست مری جرأتِ رندی نے مجھے
ورنہ تیرے لبِ رنگیں کا مزا کچھ بھی نہیں

جو خدا دے تو بڑی چیز ہے احساسِ جمال
لیکن اس راہ میں ٹھوکر کے سوا کچھ بھی نہیں

آپ ہی آپ الجھتی ہے مری وحشتِ دل
اب کھلا یہ کہ غمِ زلفِ دوتا کچھ بھی نہیں

میں نہ دیکھوں تو ترے حُسن کی قیمت کیا ہے
میں نہ تڑپوں تو یہ اندازِ جفا کچھ بھی نہیں

اس ادا سے مجھے برباد کیا ہے اس نے
کر گیا کچھ بھی نہیں اور رہا کچھ بھی نہیں

جس نے رکھا ہے مرا نام بہت اس پہ سلام
کہ بجز نام یہاں اور مرا کچھ بھی نہیں

وہ شب و روز وہ خلاقِ تمنا بر میں
یا سبھی کچھ تھا میسر مجھے یا کچھ بھی نہیں
اُن کی پلکوں پہ بھی شبنم سی گری تھی دمِ صبح
میں نے پوچھا کہ یہ کیا ہے تو کہا کچھ بھی نہیں
خواب دلچسپ زیادہ ہیں حقیقت سے مگر
ہائے وہ زیست جو خوابوں کے سوا کچھ بھی نہیں
خود کو پا جاؤ کہ کچھ دور نہیں منزلِ دوست
ورنہ اے راہرو بانگِ درا کچھ بھی نہیں
شور مندر کا سنا بھیڑ حرم کی دیکھی
دل بھی تو دیکھ جہاں اس کے سوا کچھ بھی نہیں
وقت کے ساتھ بدل جاتی ہے دنیا میکشؔ
جس پہ ہم جیتے تھے وہ عہدِ وفا کچھ بھی نہیں
1959

اک کلی مرجھائی تو مرجھائے گا سارا چمن
میں ہوا غمگیں تو ہو جائے گی غمگیں انجمن
اس جہاں میں زندہ رہنے کا ہے صرف ان کو ہی حق
واسطے حق کے جنھیں آتا ہے مرجانے کا فن
کاش جانے تو ہر اک انسان کو اپنا ہی جزو
کاش سمجھے ساری دنیا ہی کو تو اپنا وطن
خاک کو کب تک یہ سجدے ماہ و انجم کو بھی دیکھ
جانِ قدرِ آدمیت اے پرستارِ وطن

اس جہاں میں اہلِ باطل کے لیے تختِ شہی
اس جہاں میں اہلِ دل کے واسطے دار و رسن
بعد مرنے کے ملے شاید مجھے کوئی مقام
لاش تو اب بھی ہوں میں لیکن ہوں بے گور و کفن

1959

محبت سے مری اُکتا کے جانا یاد آتا ہے
وہ پھر دانستہ ان کا روز آنا یاد آتا ہے
تمنا روز حل کرتی تھی اپنی حل شدہ مشکل
توجہ کرکے ان کا بھول جانا یاد آتا ہے
میں خود زنجیر اپنے در کی کھٹکاتا ہوں وحشت میں
مجھے اس در سے جب اُن کا بلانا یاد آتا ہے
اُسی دامن کو اب کعبہ بنا کر پوجتا ہوں میں
کسی کے ہاتھ سے دامن چھڑانا یاد آتا ہے
زمانہ دیکھتا تھا ان کو میری ہی نگاہوں سے
اب اُن کی یاد میں سارا زمانہ یاد آتا ہے
تقاضا حسن کا کیا تھا کسے معلوم ہے لیکن
مرے پاس آ کے اُن کا رُوٹھ جانا یاد آتا ہے
جو چپ رہیے تو ممکن ہے کہ وہ کافر نہ پہچانے
جو کچھ کہیے تو پھر بھولا فسانہ یاد آتا ہے
نہیں ہوتی کسی کو قدر اپنے حال کی میکش
بُرا ہو یا بھلا گزرا زمانہ یاد آتا ہے

1959

ترے چمن میں جو آتی ہے عمر رفتہ یاد
ہے ان گلوں میں مگر میری نکہت برباد
یہاں مزاج زمانہ سے کون واقف ہے
دھڑک گیا مرا جی جب ہوا کوئی دل شاد
کسے تھا ہوش ترے گیسوؤں کے سائے میں
ملی ہے تجھ سے جو فرصت تو آئی تیری یاد
زمانہ صفحۂ سادہ ہے اور کچھ بھی نہیں
یہ تیرا دل اسے ویراں بنا دے یا آباد
گزر گئے ہیں دلوں میں خلش چھپائے ہوئے
شہید تیرے کرم کے نہ کر سکے فریاد
نہ زحمتِ درودیوارم اور نہ منتِ معمار
خدا ہمیشہ رکھے خانۂ جنوں آباد
گدائے خلق نہیں صاحبانِ فکر و نظر
نہ زندہ باد کی خواہش نہ خوفِ مردہ باد
نہ جانے کتنے حسینوں کا شاہکار ہے یہ
بہت عزیز ہے مجھ کو مرا دلِ برباد
مجھے عزیز نہیں جان لیکن اے مینش
خلافِ رسمِ محبت ہے شیوۂ فرہاد
1959

اے زمیں اے آسماں اے اہلِ دل اے اہلِ فن
تم حقیقت ہو کہ نظروں کا مری دیوانہ پن

کس نے کی ترکیب عالم اس طرح اے اہل فکر
نور و ظلمت وصل و فرقت، خیر و شر، عیش و محن
معرفت کی اور بھی راہیں تھیں اے اہل نظر
خون سے بلبل کے کیوں گہرا ہوا رنگِ چمن
کس نے شبنم کو سکھایا گر یہ بزم عیش میں
کس نے پھولوں کو بتایا ہنس کے مرجانے کا فن
کس نے مرہم میں ملائے ہیں یہ نشتر اے جنوں
کیوں ہے زلفوں میں شکن کیوں ہیں نگاہیں سحر فن
دے دیا کس نے دلِ زاہد کو ذوقِ اتقا
کس نے بخشا مہ وشوں کو غمزۂ تقویٰ شکن
نکلی پڑتی ہے نقابِ روز سے کیوں زلف شب
پھوٹی ہے ردائے شب سے کیوں دن کی کرن
کون ہر ذرے میں ہے مضطر بتا اے آفتاب
اے سمندر بول ہر قطرے میں ہے کیا موج زن
کردیا کس کی نگاہوں نے دلِ میکش کا خون
خوں ہوئے بن دل کے کیا ہوتا نہ یہ رنگ سخن
1959

دیکھ کر مجھ کو سنوارا خمِ گیسو اپنا
اُن کے جادو پہ بھی کیا چل گیا جادو اپنا
کیا یہ ویرانہ رہا ہے کبھی ہم دوش بہار
جی بھرا آتا ہے کیوں دیکھ کے پہلو اپنا

پھر کئے دیتے ہیں شرمندہ یہ آنسو مجھ کو
پھر مری آنکھوں پہ رکھ دیجئے گیسو اپنا

آپ کی چشم تغافل کی جھلک ہے اس میں
خندۂ گل سے ہے پیارا مجھے آنسو اپنا

ڈھانک لے گا کسی منزل پہ مجھے دامن گل
کبھی بھر جائے گا پیمانہ لب جو اپنا

فتنۂ حشر وہیں لے کے کوئی ٹوٹ پڑا
جب میں سمجھا کہ بس اب دل پہ ہے قابو اپنا

کون دیتا ہے زمانے میں سہارا میکش
تھام لیتا ہوں میں خود آپ ہی بازو اپنا

1959

میں ذرّہ ہوں مگر صحرا میں قطرہ ہوں مگر دریا
کہ بے قطرے کے کیا دریا ہے بے ذرّے کے کیا صحرا

سوا تیرے نہیں کچھ بھی غلط کچھ بھی نہیں پھر بھی
غلط سمجھے جو کچھ سمجھے غلط دیکھا جو کچھ دیکھا

حجاب و جلوہ یکساں کر دیے یہ کس کی شوخی نے
فغاں اے خلوتِ صد جلوہ واد اے محفلِ تنہا

اٹھا رکھیں نہ کیوں محشر پہ قصدِ جلوہ فرمائی
ادھر ہے عقل نا محرم ادھر ہے عشق نا بینا

شراب و ماہتاب و روئے آب و مطرب و ساقی
بتانِ شنگ و رنگا رنگ محفل اور میں تنہا

نظر تیری بجا لیکن نظر ہی تو نہیں سب کچھ
یہ ممکن ہے کہ ہو ساحل رواں ٹھہرا ہوا دریا

کبھی سب کچھ تھا لیکن اب تو اتنا ہوش ہے کس کو
یہ دل ہے یا ترا جلوہ یہ سر ہے یا ترا سودا

ہوا سنکی فضا مہکی چراغِ بزم نے لو دی
یہ میکش کی طرف ہنستا ہوا محفل میں کون آیا

1959

سحر چمن میں گلوں کی ہنسی بھی کام آئی
مگر نسیم کی آشفتگی بھی کام آئی

جھلک رہا ہے ترا حسن بے رخی اس میں
ہمارے دل کی فسردہ کلی بھی کام آئی

وہ حسن دیکھ لیا تجھ میں جو نہ تھا تجھ میں
مری نگاہ کی نا آگہی بھی کام آئی

بسا دے مری بے منزلی نے ویرانے
جنابِ خضر مری گمرہی بھی کام آئی

جنوں سہی یہ مرا ترکِ آرزو لیکن
مرے جنوں میں تری بے رخی بھی کام آئی

رہِ غلط پہ قدم رکھ کے لوٹ آیا ہوں
کبھی کبھی مری بے ہمتی بھی کام آئی

وہاں ملے وہ جہاں کا مجھے گماں بھی نہ تھا
مرا جنوں مری آوارگی بھی کام آئی

مری طلب سے زیادہ ملا مجھے میکش
دمِ سوال مری خامشی بھی کام آئی

1959

یہ تیرا وہم دگماں وہم دگماں ہے کہ نہیں
یہ جہاں کچھ بھی ہو لیکن یہ جہاں ہے کہ نہیں
باغباں تیری توجہ میں نہیں شک لیکن
جس سے برباد ہو گلشن وہ خزاں ہے کہ نہیں
دل کو ہونے نہیں دیتا ہوں میں مایوس مگر
ہر سحر شعلہ ہر اک شام دھواں ہے کہ نہیں
جس میں رکھ چھوڑ ے ان مست نگاہوں کی شراب
ایسا شیشہ کوئی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں
خون سے اپنے جو سینچا تھا وہ گلزار سخن
آج تاراج بہار دگراں ہے کہ نہیں
جس کو تم خود بھی نہ سمجھو وہ زباں ہے مانا
سب سمجھتے ہوں جسے وہ بھی زباں ہے کہ نہیں

1960

میں جس طرف سے بھی گزرا ترا خیال لیے
چمن نے پھول حسینوں نے دل نثار کیے
تری نظر کو نہ دیکھا جہاں نے یہ دیکھا
کہ خار کس کے چبھوئے ہیں پھول کس کو دیئے

بہار زینت گلشن ہے پھر بھی کیا معلوم
بہار کے لیے گلشن ہے یا خزاں کے لیے
مرے سلام پہ اس نے چرائی جب نظریں
تو اپنے آپ کو میں نے کئی سلام کیے
زباں سے جنگ نگاہوں سے صلح ساری عمر
نہ جل سکے نہ بجھے میری آرزو کے دیے
نگاہ پھیر کے تم نے چھپا لیا ان کو
گناہ بزم میں جو چشم آرزو نے کیے
جنون وہوش سے بچ کر رہا ہوں اے میکش
کیے نہ چاک کبھی میں نے پیرہن نہ سیے
1960

کلائی اس کی دلوں کی طرح دھڑک بھی گئی
نقاب اس نے سنبھالی مگر سرک بھی گئی
وہی چراغ تمنا وہی پیام اجل
جو برق راہ کو چمکا گئی کڑک بھی گئی
کبھی وہ طرز ستم بھا گئی مرے دل کو
کبھی وہ شان ترحم مجھے کھٹک بھی گئی
وہ اک نظر مری عقل وجنوں کا حاصل ہے
جو اس نظر سے ملی اور پھر بہک بھی گئی
نسیم آئی ہے شاید گلے لگا کے انھیں
کہ میرے پاس تو آئی مگر جھجک بھی گئی

بدل دیا تری غفلت نے آرزو کا نظام
یقیں تو کب تھا مگر آبروئے شک بھی گئی
نگاہِ دوست سے دل میرا خوں ہوا سیکش
نگاہِ دوست سے میری غزل مہک بھی گئی

1963

کتنے طوفاں ہیں جو ٹھہرے ہیں یہ سوچے تو سہی
ناخدا آس نہ توڑے ابھی دیکھے تو سہی
زلف برہم ہے سرِ شام ہے راہیں پُرخم
قافلہ دل کا الٰہی کہیں ٹھہرے تو سہی
بوئے گل رنگ چمن اور یہ عمرِ گزراں
سب ٹھہر جائیں گے کوئی اُسے روکے تو سہی
دوستوں کو بھی نہ تکلیفِ کرم دی میں نے
کوئی اس طرح زمانے سے نباہے تو سہی
جان دینا ترے عشاق کو دشوار نہیں
کسی شب نکہتِ گیسو تری آئے تو سہی
وہ مچلتی ہوئی زلفیں وہ الجھتی ہوئی چاک
میں سنبھل جاؤں گا وہ خود کو سنبھالے تو سہی

1962

کس کس ادا سے زینتِ کون و مکاں رہے
ہم گل بنے بہار ہوئے باغباں رہے

اس درجہ دشمنی تو مقدر کی بات ہے
ورنہ وہ ایک عمر مرے راز داں رہے
اے دل تمام رات کٹی اُن کی یاد میں
اب دو گھڑی تو اور کوئی داستاں رہے
میں اور احتیاط محبت کی راہ میں
یہ کیسے وہ تو خود ہی مرے پاسباں رہے
ہے اس کی خاک میں مری عمروں کا رنگ و بو
میرا وطن الٰہی ہمیشہ جواں رہے
اہل حرم وہاں ہیں یہاں اہل دیر ہیں
اب کس سے جا کے پوچھیے انساں کہاں رہے
1963

ہم نفس اس چمنِ دہر میں کم آتے ہیں
بوئے گل سے کہو ٹھہرے ابھی ہم آتے ہیں
عاشقوں کی سی تجھے تاب کہاں ہے اے دوست
ورنہ مجھ کو بہت انداز ستم آتے ہیں
کم نگاہی بھی تری مصلحت آمیز نہ ہو
دل سے نالے مرے لب تک بھی تو کم آتے ہیں
تیری نظروں میں تو کچھ سحر ہے ظالم ورنہ
اپنے قابو میں بھی مشکل ہی سے ہم آتے ہیں
کیا برہمن میں بھی باقی نہ رہی بوئے وفا
آج کیوں لوٹ کے کعبے میں صنم آتے ہیں

ہے یہ انسان ہی وہ قبلۂ برحق کہ جسے
سجدہ کرنے کے لیے دیر و حرم آتے ہیں
خوب تھا ان کی توجہ کا زمانہ میکش
اب تو شاید انھیں ہم یاد بھی کم آتے ہیں
1962

یہ رنگ و نور بھلا کب کسی کے ہاتھ آئے
کدھر چلے ہیں اندھیرے یہ ہاتھ پھیلائے
خدا کرے کوئی شمعیں لیے چلا آئے
دھڑک رہے ہیں مرے دل میں شام کے سائے
بجھا نہ صبح کو بھی وہ چراغ لالہ رخاں
جو شامِ حسن میں نظروں سے ہم جلا آئے
میں اپنے عہد میں شمعِ مزار ہو کے رہا
کبھی نہ دیکھ سکے مجھ کو میرے ہمسائے
کہاں وہ اور کہاں میری پُر خطر راہیں
مگر وہ پھر بھی مرے ساتھ دور تک آئے
چلے چلو کہ بتا دے گی راہ خود رستے
کہاں ہے وقت کہ کوئی کسی کو سمجھائے
میں اپنے دل کو تو تسکین دے بھی لوں میکش
وہ مضطرب ہیں بہت کون ان کو سمجھائے
حرم کی آبرو ہم نے بہت رکھی پھر بھی
کئی چراغ صنم خانے میں جلا آئے

سمجھ کے غیر وہ خوش ہیں تباہ کرکے ہمیں
اور ایک ہم ہیں کہ یہ بات کہہ کے شرمائے
1969، 1966

یہ جہاں ایک نظر اور نظر کچھ بھی نہیں
وہ جہاں صرف خبر اور خبر کچھ بھی نہیں
ان کی خوشبو سے مہکتی مری سانسوں کے سوا
اور اس باغ میں اے بادِ سحر کچھ بھی نہیں
رنگ و بو کا یہ جہاں کار گہِ لالہ رُخاں
دیکھنے کو تو بہت کچھ ہے مگر کچھ بھی نہیں
رات شبنم کی طرح ہوگئی پھولوں میں بسر
اب یہ کیا غم ہے اگر وقتِ سحر کچھ بھی نہیں
نقشِ پا بھی تو ٹھہرتے نہیں راہی کی طرح
منزلِ عشق بجز راہ گزر کچھ بھی نہیں
سایہ ہی سایہ ہے اِن آئینوں کو چھو کے نہ دیکھ
یہ خدوخال ورخ وزلف وکمر کچھ بھی نہیں
یہ حرم ہے یہ صنم خانہ یہ دنیا ہے یہ دیں
ہم اُدھر دل لیے بیٹھے ہیں جدھر کچھ بھی نہیں
میری منزل کے نشاں ہیں مرے رستے کا غبار
انجم و کاہکشاں شمس وقمر کچھ بھی نہیں
ایک ہی رنگ پہ ہے حالتِ دل اے میکش
یہ وہ عالم ہے جہاں شام وسحر کچھ بھی نہیں
1967

خزاں کی تیغ پہ ہے خون نسترن باقی
ابھی ہے رنگ چمن نکہت چمن باقی
بدل گیا ہے چمن میں مزاج لالہ وگل
ہے اک مجھی میں تری بوئے پیرہن باقی
ہوا زمانہ کہ رستے میں عشق کے ویراں
نہ راہرو ہی کوئی ہے نہ راہزن باقی
چلے تھے چند قدم ہی وہ میرے ساتھ مگر
ہے آج تک رہِ الفت میں بانکپن باقی
نہ بت کدے میں برہمن نہ شیخ کعبے میں
مگر ہے معرکہ شیخ وبرہمن باقی
فسانے کیا مری وارفتگی کے تازہ ہیں
نہیں تو زلف بتاں میں ہے کیوں شکن باقی
مجھی کو قدر زمانہ نہیں ہے اے میکش
وگرنہ ہے تو زمانے میں قدر فن باقی
1966

یہ میکدہ تو ہے ساقی گری کا نام تو ہے
نہیں ہے جام جو گردش میں ذکر جام تو ہے
جو بچ بچے تو نکالیں گے گل چمن والے
ابھی تو نام بدلتے ہیں یہ بھی کام تو ہے
نمود گل کو بتاتے ہیں خار فیض اپنا
کچھ اس کا پھل نہ ملے پھر بھی اس میں نام تو ہے

سنے نہ کوئی مگر ہم فغاں کیے جائیں
نہ ہو کچھ اور قفس میں یہ انتظام تو ہے
گواہ میرے گرفتار روز حشر ہوئے
یہاں بھی کچھ مرے قاتل کا اہتمام تو ہے
کسی کا نام میں لیتا نہیں ہوں اے میکش
مگر جہاں میں شرافت کا قتل عام تو ہے

سچ بتا اہل چمن کو میں کبھی یاد آیا
کچھ مرا ذکر بھی اے نکہت برباد آیا
کیا زمانہ دل مرحوم کا تھا کیا کہیے
تم بھی تو دیکھنے والوں میں تھے کچھ یاد آیا؟
اس میں خوش ہونےکی کیا بات ہے اے اہل چمن
ایک صیاد گیا دوسرا صیاد آیا
بتکدے والوں کو تھی ہم سے شکایت کیا کیا
اب پڑی سر پہ جو اپنے تو خدا یاد آیا
دین ودنیا سے کوئی کام نہ تھا تیرے سوا
اب سمجھ آئی تو وہ عہد جنوں یاد آیا
1965

کہیں بیٹھے تو دل برداشتہ ہے
فقیروں کا مکاں کوئی نہیں ہے

سنا کرتے ہیں ہم یوں سب کی جیسے
ہماری داستاں کوئی نہیں
جہاں میں ہوں وہاں تو بھی ہے اے دوست
جہاں تو ہے وہاں کوئی نہیں ہے
بدل جاتا ہے ہر لمحے وہ کافر
مقامِ عاشقاں کوئی نہیں ہے
ہے میر کارواں ہر اک یہاں
کہ میر کارواں کوئی نہیں ہے
1965

پردہ رکھا ہے مرے چاک گریباں نے بہت
ورنہ بھڑکائی تھی اس جنبش داماں نے بہت
مسکرا کر تری دزدیدہ نظر پھر نہ ملی
خون افسانہ کیا شوخی عنواں نے بہت
میرے نظارے کو خود آگئے وہ شمع لیے
بند کی آنکھ مرے دیدۂ حیراں نے بہت
تار بھی اب تو جنوں نے نہیں چھوڑا ورنہ
ہاتھ چومے ہیں تمھارے مرے داماں نے بہت
یہ کلیسا ہے یہ مسجد ہے یہ مندر ہے صنم
بت تراشے ہیں مرے جذبۂ ایماں نے بہت

تم سے رنگ نہ تھے لالہ وگل، اے مہوش،
[illegible] گلستاں سے بہت
1965

باغ بننا اُسے زیبا ہے نہ صحرا ہونا
دل کی معراج ہے ناکام تمنا ہونا
آپ بے پردہ چلے آیئے میں بزم میں ہوں
مجھ کو آتا ہے نقابِ رُخِ زیبا ہونا
منتظر تیری توجہ کی رہی موت وحیات
قتل کرنا تجھے آیا نہ مسیحا ہونا
تم نے دیکھا ہے کبھی صبح کی بے نوری کو
تم پہ گزرا ہے کبھی شام کا تنہا ہونا
کارواں لے کے چلے آتے ہیں گزرے ہوئے دل
کیا قیامت ہے مرے واسطے تنہا ہونا
کیا کروں یاد جو آجائے وہ مخمور نظر
ورنہ میکش مجھے کیا فرض تھا رسوا
1964

فروغِ حسن سے ہر ذرّہ ایک عالم ہے
فغاں کی فرصتِ نظارگی بہت کم ہے
مزاجِ حسن کو پہچاننا ہے کارِ دراز
معاف کر کہ ابھی عمرِ آرزو کم ہے
نہیں ہے نظمِ جہاں کا سنوارنا مشکل
ستم یہ ہے کہ دلوں کا نظام برہم ہے
وہ لوگ بھی ہیں نہیں اپنی فکر بھی جن کو
یہ ایک ہم ہیں کہ سارے جہان کا غم ہے

لگا کے دل کسی کافر سے دیکھ اے زاہد
یقین کر کے محبت ہی اسم اعظم ہے
ملی ہے اُن کے تغافل سے دل کو رخصت غم
وہ اب ملیں نہ ملیں یہ شرف ہی کیا کم ہے
مری نگاہ نے ہستی کو دی ہے ضو میکش
میں دیکھ لوں تو یہ موتی ہے ورنہ شبنم ہے
1964

ترے گیسو کی بوغم کے مسافر پا ہی جاتے ہیں
صبا کتنا سنبھالے یہ تو کچھ لہرا ہی جاتے ہیں
نہ ہوں خوش جب بھی نظریں کچھ نہ کچھ تو کہہ ہی دیتی ہیں
وہ بے مہکے ہوئے کچھ پھول تو برسا ہی جاتے ہیں
نہیں ہے منحصر غم اور خوشی پر آپ کیوں سوچیں
مری آنکھوں میں آنسو بے سبب بھی آ ہی جاتے ہیں
کبھی گزرے دنوں کی یاد ان کو آ ہی جاتی ہے
شکایت لے کے میری پاس میرے آ ہی جاتے ہیں
معلم ہوں کہ ناقد حضرت واعظ ہوں یا ناصح
نہ سمجھیں خود مگر اوروں کو تو سمجھا ہی جاتے ہیں
خوشی سے بھی دلوں کا خون ہو جاتا ہے اے میکش
یہ پھولوں کی طرح کھلتے ہیں تو مرجھا ہی جاتے ہیں
1963

ملا ہے مجھ کو وہ دل جس کو غم کی خو سی ہے
وہ آگئے ہیں مگر پھر بھی جستجو سی ہے

نظر نظر ہے فسانہ نفس نفس افسوں
یہ خامشی بھی مگر تیری گفتگو سی ہے

کسی سے کہہ نہ سکوں خود یقین کر نہ سکوں
اک انتظار سا ہے اک آرزو سی ہے

دماغ و دل ہے معطر گرہ کھلے نہ کھلے
یہ زندگی بھی تری زلف مشکبو سی ہے

صبا ہی راستہ بھولی کہ تو نے یاد کیا
یہ آج کیوں مری سانسوں میں تیری بو سی ہے

سکون دل کو کسی حال میں نہیں اے دوست
ہجوم یاس میں بھی ایک آرزو سی ہے

جنوں سے رونق بزم خرد ہے اے میکش
جو ہم نہ ہوں تو یہ دنیا مقام ہو سی ہے

1963

جنگ میں بھی ہیں صلح کے پہلو صلح میں بھی ہیں جنگ کی شانیں
اس جیسے معصوم کو یارب کس نے سکھلائی ہیں یہ گھاتیں

جسم پہ یوں پوشاک سجی ہے اوس ہو جیسے پھولوں پر
رنگ سنہری گل گالوں پر جیسے مانک کندن میں

اُس کی آنکھیں اس کی آنکھیں کیسی ہیں اب کیا کہیے
اچھا ٹھہرے سوچنے دیجے اس کی آنکھیں اس کی آنکھیں

1963

ہے یاد مجھ کو لالہ خونیں کفن کی بات
بے خونِ دل کے بن نہیں سکتی چمن کی بات
اچھا کیا یہ تیری جفاؤں نے ورنہ ہم
بھولے ہوئے تھے دیر سے دار و رسن کی بات
کانٹوں پہ آنچ ہے تو کلیاں ہیں پھر نہ پھل
کانٹوں ہی کی نہیں یہ ہے سارے چمن کی بات
کچھ تیرے ذکر کا تو سلیقہ ہے ورنہ یوں
اپنی ہر ایک بات ہے دیوانہ پن کی بات
بیخود صبا ہے غنچے ہیں چپ سبزہ خواب میں
کس نے کہی چمن میں ترے پیرہن کی بات
میں اور برگِ گل کو کروں منفعل مگر
چھیڑی صبا نے خود ترے نازک بدن کی بات
تنہائی میں بھی تجھ پہ اک عالم تو ہے مگر
جو انجمن کی بات ہے وہ انجمن کی بات
نفرت جو آدمی سے سکھائے وہ کفر ہے
دین اور زبان کی ہو کہ قوم و وطن کی بات

میکش سوائے حق مجھے منظور ہی نہیں
زمزم کا تذکرہ ہو کہ گنگ وجمن کی بات

1963

جس سے دل ٹھہر جاتا ایسی شے کوئی نہ ملی
تیری دوستی نہ ملی تیری دشمنی نہ ملی
یوں تو تھک کے بیٹھے بھی دم بھی لے لیا لیکن
زندگی کے رستے میں چھاؤں بھی گھنی نہ ملی

اک نظر ایک تبسم ہے مسافر کو بہت
چھاؤں کی یاد میں بھی راہ گزر جائے گی
کوئی پیغام کسی کا نہ کسی کی نکہت
کیا خبر تھی کہ صبا یوں بھی کبھی آئے گی

کبھی ہنسا کبھی رویا میں ان کا خط پڑھ کر
اگر چہ بات نہ ہنسنے کی تھی نہ رونے کی

ظلم کرتے ہیں وفا ہو جیسے
یا وفاؤں کا صلا ہو جیسے
یوں مری سمت نہ دیکھا اس نے
مجھ کو ہی دیکھ رہا ہو جیسے

ان کا انداز خموشی اللہ
ابھی کچھ مجھ سے کہا ہو جیسے
کچھ نہیں پھر بھی ہے سب کچھ یہ جہاں
اس کا نقشِ کفِ پا ہو جیسے
ایسی کیا شے تھی محبت کی نظر
ہم نے کچھ جرم کیا ہو جیسے
اُن کی آغوش میں ہے میرا خیال
دامنِ گل میں صبا ہو جیسے
یہ بھی اک طرز کرم ہے میکش
ظاہرا مجھ سے خفا ہو جیسے

1967

سر ہوگئے ان کے بے جب ہم
ہیں آدمی کتنے بوالعجب ہم
اس گھر کو ذرا سجا کے رکھنا
ٹھہرے ہیں یہاں بھی ایک شب ہم
اللہ یہ ذوقِ درد مندی
لڑ لیتے ہیں تم سے بے سبب ہم
آنکھوں میں نمی دلوں میں یادیں
ہیں صبح کو داستانِ شب ہم
کچھ سمجھا کسی نے کچھ کسی نے
تھے کس کا پیام زیرِ لب ہم

ہر بار ملے ہم ان سے ایسے
جیسے نہ کبھی ملیں گے اب ہم
بیٹھے ہیں جہاں لٹا کے اپنا
اَب آپ سے کیا کریں طلب ہم
دیکھا ہے تمھیں نگاہ بھر کر
ہیں واقعی کتنے بے ادب ہم
برسوں میں ہوئے ہیں رام میکش
دل دیتے ہیں یوں کسی کو کب ہم
1971

میں کتنے ماہ پارے راستے میں چھوڑ آیا ہوں
نہ جانے آرہا ہے یاد کیا کیا دیکھ کر تجھ کو

مہک پاکر تری گلشن کی شاخیں جھوم جاتی ہیں
گلی کا رنگ ہو جاتا ہے گہرا چوم کر تجھ کو

نہ آئی راس وہ سادہ نگاہی میری رندی کو
کیا کن مشکلوں سے بدگماں اے بے خبر تجھ کو

سکوں بے راحت وتسکیں سفر بے منزل ومقصد
مرے ساتھ آ بتاؤں راہ میں اے راہبر تجھ کو
68 سے 78 تک

وہ ہیں بے گانہ سے اور میں ہوں خراب تمکیں
داستاں پھر بھی ہوئی جاتی ہے دل کی رنگیں
میں مسافر ہوں مری فکر نہ فرمائے کوئی
کٹ گیا دن تو گزر جائے گی اب رات کہیں
عمر اک نزع کے عالم میں بسر کی میں نے
زیست کا وہم ہی کب تک کہ ہو مرنے کا یقیں
داستانیں بھی غلط عرض حقیقت بھی فضول
تم سے کہنے کے لیے آج کوئی بات نہیں
بے پئے ایک سرور ان کو ہے اک کیف مجھے
بے سنے ایک گماں ان کو ہے اک مجھ کو یقیں
فخر کر فخر گلِ تر کہ تجھے دیکھ کے آج
آ گیا یاد کسی شوخ کا روئے رنگیں
اور پاس آؤ ذرا اور ہنسو اور ہنسو
ہاں ذرا اور حسیں اور حسیں اور حسیں

کچھ اور مجھ کو تمنا نہیں بجز اس کے
کہ زندگی مری کٹ جائے زندگی کی طرح

کھٹکنے لگتی ہے اک پھانس سی مرے دل میں
تری نگاہ تمنا کی بے کسی کی طرح

اگر کہوں تو مجھے آدمی کہیں گے بُرا
کہ میرے دل میں بھی الفت ہے آدمی کی طرح

مقام ایسے بھی آئے ہیں دوستی میں بہت
کہ دوست نے مجھے دیکھا ہے اجنبی کی طرح

1969ء

یہ جہاں تجھ کو فقط وہم و گماں لگتا ہے
مجھ کو ہر ذرّہ یہاں ایک جہاں لگتا ہے
پیچ و خم راہ کا رکھتا ہے پریشان تجھے
مجھ کو یہ بھی خم گیسوئے بُتاں لگتا ہے
راہ کا سنگ ہے اک سنگ گراں تیرے لیے
مجھ کو یہ سنگ بھی منزل کا نشاں لگتا ہے
میری نظروں میں ہے یہ ابر بہاری کا سفیر
تجھ کو چھایا ہوا گلشن پہ دھواں لگتا ہے
روز آجاتی ہے شب وعدۂ فردا لے کر
کتنا اچھا یہ جہان گزراں لگتا ہے
چال سے ان کی چمک اٹھتا ہے راہوں کا غبار
مجھے ہر رستہ یہاں کاہکشاں لگتا ہے
اور کچھ دم مری آغوش میں اے عکس شفق
تو مجھے نامہ بر لالہ رخاں لگتا ہے

ایک ہلکا سا تبسم مری راتوں کا چراغ
وہ بھی تیرے لب نازک کو گراں لگتا ہے
بھر گئی کان میں کچھ اس طرح وہ شیریں تلخی
اب کسی بات میں دل اپنا کہاں لگتا ہے
دل کی کچھ بات کریں تجھ سے یہاں آ بیٹھ
تو مجھے واقف اسرار جہاں لگتا ہے
1971

لوگ تو اور بھی تھے دنیا میں
کیوں مرے دل کو بھا گئے وہ لوگ
ہر بہانے ہے دل کو ان کی یاد
کچھ ہوا اور آ گئے وہ لوگ
1971

زندگی تجھ سے ترا حال نہ پوچھا ہم نے
پائی بھی تھوڑی سی فرصت تو جوابوں میں گئی
پیرہن چاک ہے دل خون ہے ناخن زخمی
ہم یہ سمجھے تھے کہ گلشن میں گلابوں میں گئی
تلخ ہے اتنی حقیقت یہ خبر تھی کس کو
عمر وہ کتنی سہانی تھی جو خوابوں میں گئی
وہم نے کر دیا آنکھوں پہ کچھ ایسا جادو
عین دریا میں بھی ڈوبی تو سرابوں میں گئی

عشق وہ دولت بیدار ہے اے دوست کہ ہم
ذی وقاروں میں رہے حسن مآبوں میں کٹی
کیا برا ہے جو بسر ہوگئی یوں بھی اک عمر
دشت وصحرا میں رہے باغ کے خوابوں میں کٹی
1971

جنوں میں شاد ہوں دشت ودمن ملے نہ ملے
بہار آئے نہ آئے چمن ملے نہ ملے
یہ راہ ہی تو ہے گلشن نہیں ہے دیوانو
چلے چلو کوئی گل پیرہن ملے نہ ملے
خیالِ زلف سے مہکا رہا ہوں رات اپنی
شمیم زلف شکن در شکن ملے نہ ملے
ہوا سے حال کہوں رہ گزر سے بات کروں
اس انجمن میں مجال سخن ملے نہ ملے
چتا بناؤں خود اپنی چمن کے پھولوں سے
خزاں کے راج میں گور و کفن ملے نہ ملے
کر آئیں سیر ذرا چل کے دشت ویراں کی
چمن میں اب وہ بہار چمن ملے نہ ملے
سنا کے میری غزل اور ایک جام کہ پھر
ربابِ "تاج" وسرودِ "جمن" ملے نہ ملے
مرے سخن کے مخاطب ہیں اہل دل میکش
نہیں ہے فکر کوئی اہل فن ملے نہ ملے
1971

اس کے آئینۂ رُخسار کو دیکھا میں نے
اے محبت ترے معیار کو دیکھا میں نے
راستے سے کوئی مطلب تھا نہ منزل سے غرض
ساتھ چل کر تری رفتار کو دیکھا میں نے
دل کا سودا نہ کیا اور نہ کرنا تھا مجھے
ہاں مگر نقد خریدار کو دیکھا میں نے
دو قدم بھی نہ مسافر کا دیا ساتھ اس نے
آپ کے سایہ دیوار کو دیکھا میں نے
اپنی آشفتہ مزاجی پہ ہوا مجھ کو غرور
جب ترے گیسوئے خم دار کو دیکھا میں نے
عمر بھر جھوٹی خوشامد کی رہی بات اونچی
عمر بھر آپ کے دربار کو دیکھا میں نے
تیری باتوں کا کسے ہوش ہے لیکن اے دوست
سحر چشم ولب ورخسار کو دیکھا میں نے
زندگی میرے مسائل کے سوا اور بھی ہے
آج اس قلزم ذخار کو دیکھا میں نے
کچھ بتائیں تو سہی آپ کا میکش تو نہ تھا
آج اک کافر دیندار کو دیکھا میں نے

ہیں وہی دن مگر کہاں وہ دن
ہے وہی رات پر وہ رات کہاں
سن تو اے آفتابِ عالم تاب
تو نے دیکھی ہے میری رات کہاں
اک ذرا مل کے رولیں اور کہ پھر
ہم کہاں تم کہاں یہ رات کہاں
کٹ گیا دن تلاشِ منزل میں
اب گزرتی ہے دیکھیں رات کہاں
تو خدا ہی سہی مگر بے خدا
تجھ میں انسان کی سی بات، کہاں
گو وہی نغمہ ہے وہی مطرب
دل پہ اگلے سے واردات کہاں
دل کی بازی لگی ہے اب بھی مگر
ایک ہی چال میں وہ مات کہاں
ہے تمہیں سے یہ کائنات مگر
تم کہاں میری کائنات کہاں
مکتبِ عاشقی میں اے میکش
فلسفہ اور دینیات کہاں
1976

اٹھا نہ آنکھ کہ دنیا کا اعتبار نہیں
تری نگاہ ترا اعتبار ہے اے دوست

زمیں میں اس کی جڑیں دیکھتے ہو یہ بھی سہی
مگر چمن تو سر شاخسار ہے اے دوست

نہ تم ہنسے نہ مری آنکھ سے بہے آنسو
خوش ہوں کہ یہ کیسی بہار ہے اے دوست

جنون دشت بدلا رنگ ارباب چمن بدلے
نگاہیں تم نے بدلیں میں نے انداز سخن بدلے
کسی کے ہاتھ زخمی ہیں نہ پیرہن دریدہ ہے
طریق یوسفی بدلا زلیخائی کے فن بدلے
حقیقت سے فسانے تک فسانے سے نگاہوں تک
مرے پاس آتے آتے اس نے کتنے پیرہن بدلے
غلط فہمی تری نظروں نے پھیلائی ہے محفل میں
ہوس کو ہوش آئے گر تری نظروں کا فن بدلے
وہ آئیں تو کہاں آئیں لکھیں خط تو کہاں لکھیں
خدا ہی جانے میں نے کتنے گھر کتنے وطن بدلے
تری بزم طرف قائم رہی بھی تو سحر تک ہے
تری بزم طرب سے کون یہ رنج و محن بدلے
1971

جدھر دیکھو ادھر اہل ہوس کا بول بالا ہے
خدا ہی ہے جو میکش انجمن کی انجمن بدلے

وہ حسیں شکل جو اللہ نے بخشی ہے تجھے
اے زمانے یہ بتا تو نے کیا کیا اس کا

ہاں وہی جنسِ وفا جو ہے جہاں میں نایاب
ہم ہر ایک شخص سے کر لیتے ہیں سودا اس کا

1976

ہم نے ہی آپ کو پوجا ہمیں کافر ٹھہرے
ہم نے ہی ظلم سہے ہم ہی ستمگر ٹھہرے
لڑگئی موجِ ہوا سے کبھی رُخ پر مچلی
دل بھی ٹھہرے جو تری زلف معنبر ٹھہرے
بوئے گل رنگ چمن اور یہ عمر گزراں
سب ٹھہر جائیں گے دم بھر جو وہ کافر ٹھہرے
آئی گلشن میں ذرا موجِ صبا اور گئی
کس کی آغوش میں اب بوئے گلِ تر ٹھہرے
بول اے ترکِ محبت مجھے کیا کرنا ہے
وہ خفا ہو کے چلے ہی تھے کہ چل کر ٹھہرے
راہ سے بھی ہے خطرناک یہ منزل زیادہ
کوئی ٹھہرے تو یہاں سوچ سمجھ کر ٹھہرے
کوئی حق کہنے اب اس عہد میں آئے شاید
نظر آتے ہیں خلا میں کئی [illegible]
ذہن ویرانی [illegible] تماشے [illegible]
اک ویرانے میں پہنچ [illegible]

تجھے خبر ہے یہ کس سے نظر ملی تھی تری
وہ ایک مردِ قلندر کہ جو ہے شاعر بھی
دلوں کے رُخ کو سمجھتا ہے چال نظروں کی
ہے رازِ عقل سے واقف جنوں میں ماہر بھی
فریب خوردۂ عمر گزشتہ خود ہے مگر
تجھے فریب نہ دے دے کہ ہے وہ ساحر بھی
کسی کی ہجو وہ لکھتا نہیں مگر جو لکھے
پناہ مانگیں انھیں چنگیز اور نادر بھی
کسی کی مدح وہ کرتا نہیں مگر جو کرے
حبیب خلق بنے بادشاہ جابر بھی
اگر وہ تیرا سراپا لکھے تو بے دیکھے
زمانے بھر کا ہو معبود تجھ سا کافر بھی
مگر اسے یہی ملحوظ ہے کہ حسن ترا
نگاہِ اہل ہوس میں نہ ہو کہیں رسوا

مجھے چمن میں نسیم بہار لائی ہے
چمن میں کون مرے دل کی بات سمجھے گا
مچا ہوا ہو جہاں رنگ و بو کا ہنگامہ
وہاں دلوں کی کوئی واردات سمجھے گا

عمر انساں کے یہ ہزاروں سال
ایک دن رات سے نہیں افزوں

ایک دن رات کیا ہے اک لمحہ
اور اک لمحہ کیا سوائے فسوں

جناب شیخ باریش مطہر
بنے جاتے تھے اک مسجد کے منبر
کہا میں نے کہ اے مسجد کے منبر
بنو تم صف مصلّی کی تو بہتر
کہ یوں تم روبہ قبلہ نور ہو گے
بنے منبر تو کعبہ سے پھرو گے

کل اک ملازم اوقاف مجھ سے کہنے لگے
ہیں آپ عالم دیں اور تخلص اتنا پست
مرے جواب سے پہلے ہی بول اٹھے حافظ
وہ بادہ خوار حقیقت وہ مے گسار الست
فقیہہ مذہب ما مست گشت وفتوا داد
کہ مے حرام ولے بہ زمال اوقاف ست

کتبہ قبر

جو فرش گل پہ سو نہ سکا جو ہنس نہ سکا جو رو نہ سکا
اس خاک پہ اُس شوریدہ سر نے آخر آج آرام کیا
میکش اکبرآبادی

پروفیسر فضل امام کی ذات محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ تحقیق وتنقید ان کا میدان رہا ہے۔ انتخاب کلیات جوش، دیوان درد اور انتخاب حسرت موہانی بھی ان کی تحقیق و تدوین سے منظر عام پر آچکے ہیں جو برصغیر ہند و پاک کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہیں۔ میکش اکبر آبادی سے ان کو خصوصی تعلق خاطر رہا ہے اسی لیے موصوف نے میکش کے مجموعہ ہائے کلام کی تلاش وتحقیق کی جو عرصے سے نایاب رہے ہیں اور اب کلیات کی شکل میں زیور طبع سے آراستہ ہوکر آپ کے سامنے ہیں۔ قوی امید ہے کہ اس کی پذیرائی اہل علم وادب کے درمیان میں گرم جوشی سے کی جائے گی اور تشنگان تصوف مستفید ہوں گے اس لیے کہ میکش کی شعری کائنات بہت ہی بسیط اور عمیق ہے۔

اکبرآباد (آگرہ) صدیوں سے شعر وادب کا مرکز رہا ہے۔ یہاں کی شعری روایت نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ خاں آرزو سے لے کر میر تقی میر اور پھر میر سے غالب ونظیر نے گلہائے رنگارنگ سجائے ہیں۔ اسی سرزمین سے سید محمد علی شاہ میکش اکبرآبادی نے فکروفن کے تابناک گوشے پیش کیے ہیں۔ ان کے تین مجموعۂ کلام منظر عام پر آئے تھے جن کی اہل شعر وادب نے گراں قدر پذیرائی کی تھی۔ پہلا مجموعہ "مے کدہ" 1931، دوسرا مجموعہ "حرف تمنا" بار دوم 1955 اور تیسرا "داستان شب" 1979 میں زیور طبع سے آراستہ ہوا تھا لیکن یہ مجموعہ ہائے کلام عرصے سے دستیاب نہیں تھے۔ حالانکہ ان کی شعری رعنائیاں ہر صنف سخن میں جلوۂ صد رنگ پیش کرتی ہیں۔ دراصل میکش تصوف کے رازہائے سربستہ کو اپنے اشعار میں فنی چابک دستی سے پیش کرتے ہیں۔ وہ تصوف کے فلسفیانہ اور پیچیدہ مسائل کو غزل کے پیمانے میں ڈھالنے کا ہنر جانتے ہیں۔ غزل کی دروں بینی، ایمائیت اور رمزیت کو بڑے سلیقے سے شعری پیکر عطا کرتے ہیں۔ عشق حقیقی اور عشق جاناں کی جملہ کیفیات کی ترجمانی ان کے شعری مجموعوں کی انفرادیت ہے۔ نعت، منقبت، غزل اور نظم وغیرہ میں پرتاثیر طبع آزمائی کی ہے۔

خوشی ہے کہ ان مجموعہ ہائے کلام کو کلیات کی شکل میں پروفیسر فضل امام نے اپنے مقدمہ کے ساتھ مرتب کیا ہے جسے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان حکومت ہند نے شائع کرنے کا شرف حاصل کیا ہے۔

ISBN 978-93-5160-176-0
9 789351 601760

فروغ اردو بھون
NCPUL
New Delhi

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون ایف سی، 33/9
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی-110025

قیمت -/180 روپے